اضافہ شدہ ایڈیشن

PSC، ایم اے ہسٹری اور ایم اے کشمیریات کے سلیبس کے عین مطابق

کشمیریات

حصہ اوّل

محمد سعید اسعد



سوچیے اور سمجھیے: کیا آپ کا حق نہیں ہے کہ

۱۔ آپ اپنے وطن عزیز جموں کشمیر کے بارے جاننے کی کوشش کریں۔
۲۔ آپ اپنی تاریخ، جغرافیے، تہذیب وثقافت اور علم وادب سے آگاہ ہوں۔
۳۔ آپ کو درست، صحیح، دوٹوک اور واضح معلومات مہیا ہوں۔
۴۔ آپ کا نصابِ تعلیم خود آپ کے اپنے ریاستی ماہرین تعلیم تیار کریں۔
۵۔ آپ پر قابض قوتوں کا تیار کردہ نصاب جبراً مسلط نہ کیا جائے۔
۶۔ آپ کے تعلیمی اداروں میں کشمیر سٹڈیز کو نصابِ تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا...

آپ کے یہ بنیادی حقوق کب... کیوں... اور کس نے سلب کر رکھے ہیں؟

ادارہ نِکس میرپور

کشمیریات

(حصہ اوّل)

محمد سعید اسعد

نِکس
میرپور

ہماری تحقیقی و فکری کاوشوں کا مقصد یہ ہے کہ کشمیر کی نئی نسل کو اس عظیم قومی سرمائے کی تباہی کا احساس دلایا جائے جو غیر ملکی تسلط کے سبب برباد ہو رہا ہے۔

نام کتاب	ـــــــ	کشمیریات (حصہ اوّل)
مصنف	ـــــــ	محمد سعید اسعد
اشاعت اوّل	ـــــــ	اکتوبر 2004ء
اشاعت دوم	ـــــــ	فروری 2006ء
اشاعت سوئم	ـــــــ	اکتوبر 2008ء
اشاعت چہارم	ـــــــ	اگست 2009ء
اشاعت پنجم	ـــــــ	نومبر 2010ء
اشاعت ششم	ـــــــ	نومبر 2012ء
تعداد	ـــــــ	ایک ہزار
قیمت	ـــــــ	150 روپے

ناشر
نیشنل انسٹیٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نکس)
مکان نمبر 59 سیکٹر 2-F میر پور جموں کشمیر

انتساب

پیاری

بیٹی

کشف

کے

نام

محمد سعید اسعد

فہرست

حرفِ آغاز

حال ہی میں پبلک سرس کمیشن آزاد جموں کشمیر نے تحریری امتحانات میں شامل ہونے والے امیدواروں کے لیے کشمیریات (Kashmir Studies) کے حوالے سے پاکستان آفیئرز کے پرچے میں 25 نمبر کشمیر سٹڈیز کے لیے مختص کیے ہیں۔ حالانکہ پبلک سروس کمیشن کے اربابِ اختیار کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے تھا کہ کشمیر سٹڈیز کے لیے 100 نمبر کا ایک الگ پیپر مختص کرنا انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ مقابلے کے امتحانات میں شریک ہونے والے طلباء و طالبات اپنے وطنِ عزیز جموں کشمیر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اخذ کر سکیں۔ چلیے یہ بھی غنیمت ہے کہ PSC کے انٹرویوز کے ساتھ ساتھ اب تحریری امتحانات کے لیے بھی کشمیریات کا چھوٹا سا گوشہ مختص کیا گیا ہے۔ سلیبس میں اس حالیہ تبدیلی کے پیشِ نظر ہی یہ کتاب ''کشمیریات (حصہ اوّل)'' چند روزہ محنت کے بعد تیار کی گئی ہے۔ تاریخ کشمیر اور سیاسیاتِ کشمیر کا ادنیٰ سا طالب علم ہونے کے ناطے یہ سب موضوعات میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی مثل تھے۔ اس لیے میں نے اپنا قومی فرض سمجھتے ہوئے طلباء و طالبات کی سہولت کی خاطر ان موضوعات کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ موضوعات طلباء کی صلاحیت اور ذہنی سطح کو پیشِ نظر رکھ کر مختصراً تیار کیے گئے ہیں ورنہ ان موضوعات میں سے ہر ایک موضوع پر سیکڑوں صفحات لکھے جا سکتے ہیں۔ موضوعات کو آسان، عام فہم اور معلوماتی انداز سے برتا گیا ہے۔ غیر ضروری، غیر معیاری اور غیر حقیقی مواد سے پرہیز کیا گیا ہے۔

پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں شامل ہونے والے طلباء و طالبات سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیری قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے یہ ہماری قومی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے وطنِ عزیز کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، ثقافت اور علمی و ادبی سرمائے سے آگاہی حاصل کریں۔ یہ آگاہی ہمیں صرف مقابلے کے امتحانات کے لیے حاصل نہیں کرنی بلکہ اقوامِ عالم کے مابین جو مقابلہ جاری ہے اس میں سرخروئی کے لیے بھی ہمیں یہ علم حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ جب تک ہم اپنے وطن کے بارے کچھ نہیں جانتے ہوں گے تو پھر اس وطن کی عزت و آزادی اور ترقی و خوشحالی نیز بقاء کی لڑائی ہم کیسے لڑیں گے؟! اپنے وطن کے بارے میں ہمارے پاس جو علم ہے وہی ہمارا ہتھیار ہے۔ اس ہتھیار کو اپنے جذبوں سے تازہ اور تیار رکھیے۔

بحیثیت کشمیری ہمیں گذشتہ تین نسلوں سے جس المیے کا سامنا ہے وہ یہی ہے کہ ہم اپنی سادگی، لاعلمی اور لاشعوری کے سبب دوسروں کا یا تو تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں یا پھر ان کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ آیئے ہم تاریکی، جہالت، عصبیت اور غلامی کے اندھیرے راستوں سے نکل کر علم، شعور، ترقی اور آزادی کی روشن راہوں پر گامزن ہوں۔ اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔

آج یہ سطور لکھتے ہوئے میرا ضمیر مطمئن ہے کہ کشمیری قوم کا ایک ادنیٰ فرد ہونے کی حیثیت سے میں نے کشمیر کی نئی نسل کو "علم کشمیریات" سے آگاہی دینے میں حتی المقدور کوشش کی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ میں نئی نسل پر چھوڑتا ہوں۔

یہ کتاب کشمیریات کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین کے لیے بھی مفید اور دلچسپ ہوگی کیوں کہ میں نے ایک الگ پیرائے میں ان موضوعات کو قلم بند کیا ہے۔ کشمیریات کے ایسے عاشقوں سے میں کیا کہوں؟ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وطنِ عزیز جموں کشمیر کے حوالے سے مختلف موضوعات پر تحقیق کرنا اور حقائق منظرِ عام پر لانا میرا قومی فرض ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اس فرض کی بجا آوری کے لیے زندگی کا کوئی لمحہ غفلت میں نہیں گزارا۔ زیرِ نظر کتاب میری نئی تحقیقی سیریز کا حصہ اول ہے۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً میں اس عمل کو جاری رکھوں گا۔ ہاں اس سلسلے میں مجھے قارئین کے مشوروں اور رائے کی ضرورت ہوگی تاکہ میں بہتر انداز سے یہ فریضہ سرانجام دے سکوں۔ انشاء اللہ اس سلسلے کی دوسری کڑی جلد منظرِ عام پر آئے گی۔

میں شکر گزار ہوں، جسٹس (ر) عبدالمجید ملک اور شمشاد حسین ایڈووکیٹ کا کہ ان دونوں احباب کی راہنمائی سے میں نے اس کتاب کا باب "آزاد کشمیر میں آئینی ارتقاء" تیار کیا۔ میں خورشید نیشنل لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر نصر اللہ ناصر اور ان کے دیگر سٹاف ممبران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں انہوں نے مجھے مواد کی فراہمی میں بھرپور تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سچ لکھنے، حق بات کہنے اور علمِ کشمیریات کو عام کرنے کی بے پایاں توفیق عطا فرمائے۔

(اکتوبر 2004ء)

چھٹا ایڈیشن

الحمدُللہ میری انتھک محنت و ریاضت کا یہ ثمر "کشمیریات حصہ اول" نئی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ چھٹے ایڈیشن کی صورت میں منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس عرصے میں کئی ایک نقل بازوں اور چربہ سازوں نے اس کے مندرجات و مضامین کو ہو بہو اپنی کتابوں میں شامل کر کے علمِ کشمیریات کے فروغ میں حصہ لینے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن افسوس کہ وہ اس سفر کو جاری نہ رکھ سکے اور میدان چھوڑ گئے۔ میں قلم و قرطاس لئے اسی مورچے میں ڈٹا ہوا ہوں اور تادمِ حیات دست کش نہیں ہوں گا۔ (انشاء اللہ)

وما توفیقی الا باللہ۔

محمد سعید اسعد

ڈائریکٹر ادارہ نکس میرپور

0344-5663443

E.mail: niks.mirpur@gmail.com

skype id mohammadsaeedasad

Face id saeedasad

1

معاہدہ امرتسر (16 مارچ 1846ء)

پسِ منظر

معاہدے کا متن

مزاحمت

ایک غلط فہمی کا ازالہ

معاہدے کی اہمیت و افادیت

پسِ منظر:

پنجاب کی سکھ سلطنت کے حکمران رنجیت سنگھ نے اپنے چالیس سالہ دورِ اقتدار (1799ء تا 1839ء) کے بعد جولائی 1839ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے وزیر دھیان سنگھ کو معزول کر کے اس کی جگہ اپنے منظورِ نظر اجیت سنگھ کو وزیر بنا لیا۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اس تبدیلی سے ناخوش تھے۔ چنانچہ انہوں نے کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اسے وزارتِ عظمیٰ کی شہ دی۔ چنانچہ نونہال سنگھ نے لالچ میں آ کر باپ کے وزیرِ خاص اجیت سنگھ کو قتل کر دیا۔

کھڑک سنگھ کو اپنے وزیر کی موت سے سخت صدمہ پہنچا۔ چنانچہ وہ اسی غم میں 14 ماہ حکومت کرنے کے بعد 7 نومبر 1840ء کو فوت ہو گیا۔ نونہال سنگھ اپنے باپ کی میت کو جلا کر واپس آ رہا تھا کہ شاہی قلعہ لاہور کے روشنائی دروازے سے گزرتے ہوئے اس پر ایک بھاری پتھر گرا دیا گیا، وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ اب کھڑک سنگھ کی بیوہ رانی چندکور تخت نشین ہوئی۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ رنجیت سنگھ کا دوسرا بیٹا شیر سنگھ پٹیالے سے بھاری فوج لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا اور بڑی آسانی سے دارالحکومت پر قابض ہو گیا۔ رانی نے ہتھیار ڈال دیے۔ اب سکھ سلطنت کا نظام شیر سنگھ نے سنبھال لیا۔ یکم فروری 1842ء کو سرداران سندھانوالہ نے شیر سنگھ کو قتل کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ شیر سنگھ کا وزیرِ اعظم دھیان سنگھ (گلاب سنگھ کا بھائی) بھی اسی کشمکش میں قتل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سکھ سلطنت میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سکھ سرداروں نے رنجیت سنگھ کی بیوہ رانی جنداں کو آگے لایا۔ اس نے اپنے سات سالہ بیٹے دلیپ سنگھ کے سر پر تاجِ شاہی رکھا اور نظامِ حکومت خود سنبھال لیا۔ لیکن خانہ جنگی جاری رہی اور کئی نامور سردار مارے گئے۔ گلاب سنگھ کے بھائی سوچیت سنگھ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ خانہ جنگی کے سبب خالصہ فوج خود سر ہو گئی۔ رانی جنداں اور اس کا وزیر لعل سنگھ رنگ رلیوں میں مصروف رہے۔ خالصہ فوج کے حقیقی وفادار رانی اور اس کے وزیر کے خلاف بغاوت کی تدبیریں بنانے

لگے۔ رانی کو علم ہوا تو اُس نے جرنیلوں کو سبق سکھانے اور فوج کا مزاج درست کرنے کے لئے سکھ فوج کو ستلج پار انگریزی علاقے پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔ 24 دسمبر 1845ء کو جنگ چھڑ گئی۔ مدکی، فیروز شاہ، علی وال اور سبھراؤں کے مقامات پر خون ریز معرکے ہوئے۔ دریائے ستلج کا پانی سرخ ہو کر بہنے لگا۔

اس نازک وقت پر رانی جنداں نے والئی جموں گلاب سنگھ کو مدد کے لئے لاہور بلا لیا اور خالصہ دربار میں وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری سونپی اور اُسے انگریزوں سے تصفیہ کرنے پر مامور کیا۔ گلاب سنگھ نے سکھ جرنیلوں کو فوری طور پر جنگ روک دینے کا حکم دیا اور دینا ناتھ، فقیر نورالدین، دیوان دیوی سہائے اور سردار گلاب سنگھ اٹاری والے کو ساتھ لے کر اور انگریزی افواج کے سپہ سالار سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔ ابھی بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ سردار رنجودھ سنگھ مجیٹھیہ نے 10 فروری 1846ء کو سبھراؤں کے محاذ پر دوبارہ جنگ چھیڑ دی۔ ایک خون ریز معرکہ ہوا، جس میں خالصہ افواج کو شکست ہوئی۔ چنانچہ 22 فروری کو لارڈ ہارڈنگ فاتحانہ انداز سے لاہور میں داخل ہوا۔

9 مارچ 1846ء کو انگریزوں اور خالصہ دربار لاہور کے مابین ایک معاہدہ طے پایا، جس میں انگریزوں نے من مانی شرائط طے کیں۔ خالصہ حکومت پر ڈیڑھ کروڑ نانک شاہی سکہ تاوانِ جنگ عائد کیا گیا۔ اسی معاہدہ کی دفعہ 12 کے تحت قرار پایا کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو لاہور دربار اور سرکار انگلشیہ کے مابین مصالحانہ کردار ادا کرنے کے صلے میں کوہستانی علاقے پر حقِ حکمران عطا کیا جائے گا اور اس مقصد کے لئے ایک علیحدہ معاہدہ گلاب سنگھ اور سرکار انگلشیہ کے مابین طے پائے گا۔

چنانچہ 16 مارچ 1846ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین 10 دفعات پر مشتمل ایک معاہدہ طے پایا، جس کے تحت دریائے راوی سے لے کر دریائے سندھ کے مابین کشمیر، چمبہ اور ہزارہ کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے کلی اختیار میں دے دیا گیا اور طے پایا کہ اس کوہستانی علاقے پر حقِ حکمرانی حاصل کرنے کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ سرکار انگلشیہ کو 75 لاکھ نانک شاہی سکے ادا کریں گے۔

لاہور دربار کا ردِعمل

9 مارچ 1846ء کو خالصہ دربار اور سرکار انگلشیہ کے مابین طے پانے والے معاہدہ لاہور میں رئیس جموں راجہ گلاب سنگھ کو لاہور دربار اور انگریز سرکار کے لئے دوستانہ خدمات سرانجام دینے کے صلے میں پنجاب کے شمال میں پہاڑی علاقہ تفویض کیے جانے کا اقرار کیا گیا تو رانی جنداں اور اس کے وزیر اعظم لعل سنگھ نے اس کا سخت برا منایا۔ اُنہوں نے اس مجوزہ پروگرام کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مولوی حشمت اللہ خان لکھتے ہیں:

> ''رانی جنداں کو اس انتظام سے سخت مایوسی ہوئی، اس نے راجہ دینا ناتھ اور فقیر نورالدین کو سر ہنری لارنس صاحب اور کرے بارنٹ صاحب کے پاس بھیجا کہ اگر یہ ملک مہاراجہ گلاب سنگھ کو دیا گیا تو میں لندن میں جا کر استغاثہ کروں گی۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ آپ لندن تشریف لائیں تو آپ کا گھر ہے۔ مگر مہاراجہ گلاب سنگھ کے ساتھ جو اقرار ہوا ہے اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا''۔

(مولوی حشمت اللہ خان ''تاریخ جموں'' صفحہ 82)

خالصہ دربار کے وزیر اعظم لعل سنگھ نے بھی اس کی مخالفت کی، اس نے کشمیر میں متعین گورنر شیخ امام الدین کو پے در پے خطوط لکھے اور اُسے ہدایات جاری کیں کہ وہ لاہور دربار سے وفاداری استوار رکھے اور گلاب سنگھ کو کشمیر پر قبضہ نہ کرنے دے۔ اس امر کا انکشاف اس وقت ہوا جب شیخ امام الدین جالندھر سے گرفتار ہوا تو اُس نے انگریزوں کو وہ خطوط پیش کیے جو لعل سنگھ نے اُسے لاہور سے لکھے تھے۔

عہد نامہ امرتسر ....16 مارچ 1846ء

عہد نامہ جو ایک طرف حکومتِ برطانیہ اور دوسری طرف مہاراجہ گلاب سنگھ آف جموں کے مابین قرار پایا۔

برطانوی حکومت کی جانب سے فریڈرک کیوری اور بریوٹ ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعے رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی برطانیہ عظمیٰ کا آنریبل پریوی کونسل گورنر جنرل مقرر شدہ آنریبل کمپنی برائے ایسٹ انڈیا کے تمام معاملات کی راہنمائی کرنے اور کنٹرول کرنے کے حکم پر مہاراجہ گلاب سنگھ کی بنفسِ نفیس موجودگی میں طے پایا۔

دفعہ۔۱

برطانوی حکومت وہ تمام پہاڑی علاقے معہ توابعات جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں واقع ہیں، بشمول چمبہ ماسوائے لاہول کے، جو اس علاقے کا حصہ ہے جو لاہور دربار نے معاہدہ 9 مارچ 1846ء کی دفعہ 4 کے تحت حکومتِ برطانیہ کے سپرد کیا ہے، مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کی اولادِ نرینہ کے مستقل اور کلی اختیار میں دیتی ہے۔

دفعہ۔۲

جو علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو اس عہد نامے کی دفعہ اوّل کے تحت منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس کی مشرقی حدود کا تعین وہ کمشنر کریں گے، جنہیں برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ مقرر کریں گے۔ ان حدود کی نشاندہی ایک علیحدہ اقرار نامے کے تحت کی جائے گی۔

دفعہ۔۳

مذکورہ بالا دفعات کے تحت جو علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں کو منتقل کیا جا رہا ہے، اس کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کو 75 لاکھ نانک شاہی سکے ادا کریں گے، جس میں سے 50 لاکھ تو اس معاہدے کے انعقاد پر دیا جائے گا اور بقیہ 25 لاکھ اسی سال کی یکم اکتوبر کو یا اس سے پہلے ادا کیا جائے گا۔

دفعہ۔۴

مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی رضامندی کے بغیر اپنے ملک کی حدود میں تغیر و تبدل نہیں کریں گے۔

دفعہ۔۵

اگر مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت لاہور یا کسی اور ہمسایہ سلطنت کے مابین جھگڑا یا مسئلہ پیدا ہو جائے تو مہاراجہ موصوف اس تنازعہ کو ثالثی کے لئے برطانوی حکومت کے سپرد کریں گے اور اس کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔

دفعہ۔۶

مہاراجہ گلاب سنگھ خود اور اپنے وارثوں کی طرف سے عہد کرتے ہیں کہ اگر برطانوی فوج ان کے ملک کے پڑوسی علاقوں میں مصروف کار ہوگی تو وہ اپنی ساری فوجی قوت کے ساتھ برطانوی فوج کے ساتھ شامل ہوں گے۔

دفعہ۔۷

مہاراجہ گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجازت کے بغیر کسی برطانوی، یورپی یا امریکی باشندے کو اپنے ماتحت ملازم نہیں رکھیں گے۔

دفعہ۔۸

مہاراجہ گلاب سنگھ عہد کرتے ہیں کہ جہاں تک ان کے حق میں منتقل ہونے والے علاقوں کا تعلق ہے، وہ برطانوی حکومت اور لاہور دربار کے مابین طے پانے والے معاہدہ 11 مارچ 1846ء کی دفعات نمبر 7،6،5 کا احترام کریں گے۔

دفعہ۔۹

برطانوی حکومت عہد کرتی ہے کہ وہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ملک کو بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مہاراجہ کی مدد کریں گے۔

دفعہ۔۱۰

مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں اور احترام کے پیش نظر برطانوی حکومت کو ہر سال ایک گھوڑا، اچھی نسل کی 12 پشمی بکریاں (6 نر، 6 مادہ) اور تین جوڑے کشمیری شالوں کے پیش کریں گے۔☆۱

یہ صلح نامہ جو دس دفعات پر مشتمل ہے۔ آج کے روز فریڈرک کیوری اور بریوٹ میجر ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعے رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی گورنر جنرل کے حکم سے برطانوی حکومت اور بنفسِ نفیس مہاراجہ گلاب سنگھ کے

☆۱ معاہدہ امرتسر کی دفعہ دس میں 13 مارچ 1884ء کو برطانوی حکومت اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے مابین باہمی رضامندی سے ترمیم کرتے ہوئے طے پایا کہ آئندہ مہاراجہ کشمیر مذکورہ دفعہ میں درج اشیاء کے بدلے دس پاؤنڈ پشمینہ اصل حالت میں، ۱۲ پاؤنڈ اون سیاہ، سفید اور خاکی رنگ کی جیسا کہ وہ لداخ سے کشمیر لائی جاتی ہے اور سفید سوت کی تین بہترین قسموں میں سے ہر ایک کا ایک ایک پاؤنڈ برطانوی سرکار کی نذر کریں گے۔

درمیان طے پایا اور آج کے روز رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی سی بی گورنر جنرل کی مہر ثبت ہو کر منظور ہوا۔

بمقام امرتسر 16 مارچ 1846ء بمطابق 17 ربیع الاول 1262 ہجری۔

دستخط ایچ ہارڈنگ
(مہر)

دستخط.........گلاب سنگھ

دستخط.........ایف کیوری

دستخط.........ایچ ایم لارنس

شیخ امام الدین کی ناکام مزاحمت

16 مارچ 1846ء کو جب امرتسر میں گلاب سنگھ اور انگریزوں کے مابین معاہدہ طے پایا، اس وقت کشمیر میں سکھوں کے متعین کردہ گورنر شیخ امام الدین کی حکومت قائم تھی۔ اس معاہدے کی خبر سنتے ہی وہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ خالصہ دربار کے وزیر اعظم سردار لعل سنگھ نے شیخ کو خفیہ طور پر تحریری احکامات بھیجے کہ

"چونکہ تم نمک خوار قدیم اس سرکار کے ہو، تم کو چاہیے کہ کشمیر کو ہرگز خالی نہ کرو اور اگر اس امر میں تمہاری جان جاتی ہے تو عین سعادت سمجھو۔"

(مولوی حشمت اللہ خان "تاریخ جموں" صفحہ 86)

چنانچہ امام الدین نے بغاوت کا علم بلند کیا اور گلاب سنگھ کا راستہ روکنے کا عزم کر لیا۔ گلاب سنگھ کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے ڈوگرہ جرنیل لکھپت رائے اور وزیر رتنو کو فوج دے کر کشمیر پر قبضہ کرنے کیلئے روانہ کیا۔ باغی گورنر امام الدین اور اس کے وفاداروں نے حملہ آور افواج کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست سے دوچار کیا۔ لکھپت رائے اور وزیر رتنو مارے گئے۔ شیخ امام الدین نے آس پاس کے جاگیرداروں اور سرداروں کو بھی بغاوت پر اُکسایا، وہ بھی گلاب سنگھ کے خلاف ڈٹ گئے۔

اس صورتحال میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضے کے لئے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ معاہدہ امرتسر کی رو سے اس کڑے وقت میں انگریز مہاراجہ کو مدد دینے کے پابند تھے۔ چنانچہ انگریزوں کی آٹھ رجمنٹیں اور توپ خانے کے ایک دستے نے بریگیڈئر وہلر کی سرکردگی میں کشمیر پر حملہ کیا۔ سردار تیج سنگھ کی سربراہی میں سکھ فوج بھی اس حملے میں شامل تھی۔ راستے میں ڈوگرہ فوج کی بھاری تعداد بھی اس حملے میں شامل ہو گئی۔ راجوری کے مقام پر مرزا نصرت اللہ نے اس فوج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہا۔ شیخ امام الدین نے جب اتنے بڑے حملے کی خبر سنی تو وہ سرینگر سے بھاگ گیا۔ بالآخر سرکار انگلشیہ کا کمان افسر لیفٹیننٹ ایڈورڈ سرینگر میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوا۔ شیخ امام الدین کو انگریزوں نے جالندھر سے گرفتار کر لیا۔

یوں 8 ماہ کی کوششوں کے بعد 9 نومبر 1846ء کو آٹھ بجے صبح (8:00am) گلاب سنگھ سرینگر میں داخل ہو گیا۔ نجومیوں نے اسے سرینگر میں داخلے کے لئے یہی مبارک گھڑی بتائی تھی۔

ایک غلط فہمی

معاہدہ امرتسر کے حوالے سے عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ انگریزوں نے کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ کو فروخت کیا تھا اور گلاب سنگھ نے 75 لاکھ نانک شاہی سکے بطور قیمت ادا کر کے یہ علاقے خرید لئے تھے۔ یہ تصور سرا سر غلط اور تاریخی حالات وواقعات کے منافی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ سلطنتِ پنجاب اور انگریزوں کی جنگ میں پہل سکھوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس جنگ میں انگریزوں کو اگرچہ جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا، لیکن میدان انگریزوں کے ہاتھ میں رہا اور سکھ شکست سے دوچار ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ڈیڑھ کروڑ نانک شاہی سکہ بطور تاوانِ جنگ سکھ سلطنت سے طلب کیا۔ تاوان کی اس رقم کی ادائیگی تک اُنہوں نے ستلج اور بیاس کے درمیانی دوآب، چمب، کشمیر، ہزارہ اور ان سے ملحقہ تمام کوہستانی علاقہ جات سے سکھوں کی عملداری ختم کردی، رانی جنداں اور دوسرے سکھ جرنیل تاوان کی اتنی بڑی رقم ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اُنہوں نے بمشکل پچاس لاکھ روپے ادا کیے اور بقیہ ایک کروڑ کی ادائیگی تک مذکورہ بالا علاقوں پر انگریزوں کی عملداری تسلیم کرلی۔ اس صورتحال کو جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے دیکھا تو اس نے انگریزوں سے رابطہ کیا اور اُنہیں یہ پیشکش کی کہ اگر سکھ دربار تاوان کی بقیہ رقم ادا نہ کر پائے تو یہ رقم وہ اپنی گرہ سے ادا کرنے پر تیار ہے، بشرطیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی مذکورہ بالا علاقوں کا اقتدارِ اعلیٰ اسے تفویض کردے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مہاراجہ گلاب سنگھ کی یہ پیشکش قبول کرلی۔

گلاب سنگھ نہایت چالاک، دور اندیش، جہاندیدہ اور محبِّ وطن انسان تھا، اُس نے جموں کے ایک معمولی گھرانے میں آنکھ کھولی اور عام تنخواہ دار سپاہی کی حیثیت سے والئی پنجاب رنجیت سنگھ کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ وہ اپنے دو بھائیوں دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ کو بھی اس دربار میں لے گیا۔ ان تینوں بھائیوں نے اپنی قابلیت، محنت اور شجاعت وبہادری کی بنیاد پر رنجیت سنگھ کا بے پناہ اعتماد حاصل کرلیا اور سکھ سلطنت کے کرتا دھرتا بن گئے۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس کے جانشین اقتدار کی کشمکش میں اُلجھ گئے، خانہ جنگی کا ایسا دور شروع ہوا کہ مرکزی حیثیت رکھنے والے بہت سے ذمہ دار افراد مارے گئے۔ اس کشمکش میں گلاب سنگھ کے مذکورہ دو بھائی بھی کام آئے۔ گلاب سنگھ نے اس صورتِ حال سے نالاں ہوکر اپنی تمام تر توجہ جموں کشمیر پر مرکوز کردی اور سکھ دربار سے الگ ہوگیا۔

دسمبر 1945ء میں جب ایک طرف سکھ اقتدار کی رسہ کشی میں اُلجھے ہوئے تھے تو دوسری طرف اُنہوں نے دریائے ستلج پار کر کے انگریزی علاقے پر حملہ کردیا۔ چنانچہ سکھوں اور انگریزوں کے خون ریز معرکے شروع ہوگئے۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ رانی جنداں نے جب سلطنت کا شیرازہ بکھرتے دیکھا تو اس نے والئی جموں راجہ گلاب سنگھ کو مدد کیلئے بلایا اور اسے لاہور دربار میں وزارتِ عظمیٰ پر فائز کیا۔ گلاب سنگھ نے حالات پر قابو پانے کے لئے سکھ سرداروں کو جنگ روک دینے کا حکم دیا، لیکن جب سکھ سرداروں نے اس کا حکم نہ مانتے ہوئے جنگ جاری رکھی تو وہ لاہور دربار سے علیحدگی اختیار کر کے واپس جموں آگیا۔ کیونکہ تیزی سے روبہ زوال ہوتی ہوئی سکھ سلطنت سے زیادہ اسے اپنے آبائی

وطن کی فکر دامن گیر تھی۔

10 فروری 1846ء کو سبھراؤں کے معرکے میں فتحیاب ہونے کے بعد جب انگریز لاہور میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے ڈیڑھ کروڑ تاوان جنگ اور بہت سے علاقہ جات مانگ لئے۔ ان علاقوں میں گلاب سنگھ کا آبائی علاقہ جموں بھی شامل تھا۔ گلاب سنگھ نے اپنے موروثی علاقے سمیت تمام کوہستانی علاقہ انگریزوں کے تسلط میں جاتے دیکھے تو اس نے تاوان کی رقم اپنی گرہ سے ادا کر کے یہ علاقے اپنے اختیار میں لے لینے کی تدبیر بنائی۔ گلاب سنگھ کو علم تھا کہ سکھ سلطنت کا خزانہ خالی ہے اور وہ رقم دے نہیں پائے گی، چنانچہ اس نے براہِ راست انگریزوں سے بات چیت کی۔ اور تاوانِ جنگ کی رقم اپنی گرہ سے ادا کرنے کی پیشکش کی بشرطیکہ اُسے ان علاقوں کا آزاد فرمانروا تسلیم کرلیا جائے۔ انگریزوں نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ جب معاہدہ طے پانے لگا تو روپے کی کمی کی وجہ سے گلاب سنگھ نے 25 لاکھ کے عوض بیاس اور راوی کے درمیانی علاقہ چھوڑ دیا، بقیہ 75 لاکھ کے عوض دریائے راوی کا مغربی علاقہ چمب، کشمیر اور ہزارہ حاصل کرلیا۔

جی ایم میر اپنی تصنیف ''کشورِ کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

> ''انگریزوں نے مصارف جنگ کے تاوان کے طور پر ایک کروڑ روپیہ طلب کیا۔ دلیپ سنگھ کا خزانہ خالی تھا، چنانچہ اس نے کشمیر اور ہزارہ کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کردیا۔ انگریزوں کو پیسے کی ضرورت تھی، اُنہوں نے 75 لاکھ روپے کے عوض ریاست جموں کشمیر کی حکمرانی گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر کے اُسے مہاراجہ کا خطاب دیا''۔
> (جی ایم میر ''کشورِ کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ'' صفحہ 205)

معاہدے کی دفعہ 3 کی رو سے مہاراجہ گلاب سنگھ نے کمپنی کو 50 لاکھ موقع پر اور بقیہ 25 لاکھ اس سال یکم اکتوبر تک یا اس سے پہلے ادا کرنا تھا۔ 50 لاکھ تو گلاب سنگھ نے بروقت ادا کردیے، لیکن بقیہ رقم 4 سال کے عرصے میں کئی قسطوں میں ادا کی گئی۔ اس عرصے میں فریقین کے مابین خط وکتابت بھی جاری رہی۔ بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ادائیگی رقم کی رسید 29 مارچ 1850ء کو جاری کی۔ (رسید فٹ نوٹ میں ملاحظہ فرمائیں) ☆1

☆1 "The HonourableThe East India Company having received from His Highnessthe Maharaja Golab Sing the sum of Rs.75;00,000 seventy-five lakhs, in fragment of the amount guaranteed by the 111article of the treaty between the Honourable Company and His Highnessdated Umritsar the 16th March 1846. This single acknowledgement of the receipt of this whole amount is granted by the Board of Administration for the affairs of the Punjab, at the request of Dewan Jawalla Sahai, in addition to the receipts already given to His Highness agents by the receiving officers, for the installments received by them from time totime between the date of theTreaty and the 14th March 1850, the day on which the last installment was paid into the Lahore Treasury".

H.M.Lawrence
John Lawrence
C.G. Mansel

Lahore 29th March 1850

(بحوالہ "kashir" از ڈاکٹر جی۔ایم۔ڈی صوفی، صفحہ 766 مطبوعہ 1949ء پنجاب یونیورسٹی لاہور)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند تاجر تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے، اُنہوں نے قدرتی وسائل سے مالا
اس خطے کو جب بنظرِ غائر دیکھا تو اُنہوں نے اسے "سونے کی چڑیا" کا نام دیا۔ پنجاب کی سکھ سلطنت سے دو
کرنے سے پہلے ہی وہ سونے کی اس چڑیا کے بیشتر و بیش قیمت خطوں پر تسلط جما چکے تھے۔ کمپنی کی نظریں اب ا
طرف سکھ سلطنت کے ڈوبتے ہوئے سورج پر مرکوز تھیں اور دوسری طرف وہ دہلی میں مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا دیا
رہے تھے، جس دیے سے تیل خشک ہو گیا تھا اور بس اس کی تھرتھراتی لو باقی تھی۔ ایسے میں جموں، کشمیر اور ہزارہ
علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظروں میں محض پہاڑ، بیابان اور دشوار گزار علاقوں کے سوا کچھ نہ تھے۔ کمپنی کے نزدیک
پسماندہ علاقوں کی کوئی اہمیت و افادیت نہ تھی۔ وہ تو سونے کی چڑیا پر اپنے راج کا سورج طلوع ہوتے دیکھ کر پھو
نہیں سما رہی تھی۔ دولت جمع کرنے اور تجوریاں بھرنے کی انکی ہوس اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس نے چاندی کے
لاکھ نانک شاہی سکے کھنکتے دیکھ کر کوہستانی علاقہ کا اختیار و اقتدار گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظروں میں جموں کشمیر اور دیگر کوہستانی علاقے کوئی اہمیت نہیں ر
تھے۔ اس حقیقت کا اظہار لارڈ ہنری ہارڈنگ گورنر جنرل آف انڈیا کے اس خط سے ہوتا ہے، جو اس نے 14 ،
1846ء کو لارڈ ایلن برو (بحریہ کے فرسٹ لارڈ اور سابق گورنر جنرل آف انڈیا) اور خفیہ کمیٹی برائے او ویسٹ ڈمنین
نام لکھا۔ یہ خط معاہدہ لاہور کے بعد اور معاہدہ امرتسر سے دو روز پہلے لکھا گیا۔

"It will be seen by the draft of Treaty now forwarded that, in consequence of the inability of the Lahore Government to pay the stipulated indemnification for expenses of the war, or to give sufficient security for its eventual disbursement, the Hill territories, from the Beas River to the Indus, including the provinces of Kashmir and Hazarah, have been ceded to the British Government.

It is not my intention to take possession of the whole of this country. Its occupation by us would be, on many accounts, disadvantageous. It would bring us into collision with many powerful chiefs, for whose coercion a large military establishment at a great distance from our provinces and military resources would be necessary. It would more than double the extent of our present frontier in countries assailable at every point mad most difficult to defend without any corresponding advantages for such large additions of territory. How distant and conflicting interests would be created and races of people, with whom we have hitherto had no intercourse, would be brought under our rule, while the territories, excepting Kashmir, are comparatively unproductive, and would scarcely pay the expenses of occupation and management............".

(جسٹس محمد یوسف صراف ''Kashmiri's Fight for Freedom'' جلد اوّل صفحہ 191-92)

وی پی مینن لکھتے ہیں:

"لارڈ ہارڈنگ نے جو اس زمانے میں گورنر جنرل تھے۔ اس تمام علاقے پر قبضہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح برطانوی سرحد زیادہ لمبی ہو جائے گی اور اس کی حفاظت کے لئے زیادہ فوج رکھنا پڑے گی۔ علاوہ ازیں موصوف کا یہ خیال بھی تھا کہ اس طرح متصادم مفادات پیدا ہوں گے"۔

(''کشمیر اور جونا گڑھ کی کہانی'' مسٹر وی پی مینن ترجمہ رئیس احمد جعفری صفحہ 208)

معاہدہ امرتسر۔اہمیت وافادیت

معاہدہ امرتسر کو تاریخِ کشمیر میں انتہائی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخِ کشمیر میں ایسے تابندہ اور دوررس نتائج کے حامل معاہدے کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ بلاشبہ معاہدہ امرتسر اور جدید ریاست جموں کشمیر کا وجود ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 158 برس گزر جانے کے باوجود اس معاہدے کی اہمیت وافادیت پر کوئی فرق نہیں پڑا اور آج بھی تاریخِ کشمیر میں اس معاہدے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ آیئے ذرا تجزیہ کرتے ہیں کہ اس معاہدے کو تاریخِ کشمیر میں اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے۔

مملکتِ کشمیر کا احیاء

کشمیر جو صدیوں سے ایک آزاد و خود مختار ملک رہا تھا اور جس کی عظمت و جلالت کے چرچے للتہ دتہ، شہاب الدین اور بڈشاہ کے عہد میں چار دانگِ عالم میں پھیل گئے تھے۔ بالآخر 1586ء میں ہندوستان کے مغل بادشاہ اکبر اعظم کی جارحیت کا شکار ہوا اور اسے مغلیہ سلطنت میں سرکار (صوبے سے کم درجہ) کی حیثیت دے دی گئی۔ کشمیر 166 برس تک مغلوں کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد 1752ء میں افغانوں نے کشمیر پر حملہ کر کے اسے مغلوں سے چھین لیا اور اسے سلطنت کابل کا ایک صوبہ بنا دیا۔ 1819ء میں پنجاب سلطنت کے والی رنجیت سنگھ نے افغان گورنر جبار خان کو شکست دے کر کشمیر کو سلطنت پنجاب میں شامل کر لیا اور اسے ایک صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ سکھوں نے کشمیر پر 27 سال حکومت کی۔ بالآخر 1846ء کو جب پنجاب سلطنت پر انگریز قابض ہو گئے تو کشمیر بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ 9 مارچ سے 16 مارچ 1846ء تک کشمیر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت رہا۔ انگریز سامراج اب پورے ہندوستان پر تیزی سے قابض ہو رہا تھا۔ تاریخ کے انہی نازک ایام میں والئی جموں راجہ گلاب سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین 16 مارچ 1846ء کو ایک معاہدہ طے پایا، جسے تاریخ میں "معاہدہ امرتسر" کا نام دیا جاتا ہے۔

معاہدہ امرتسر کو تاریخِ کشمیر میں اور برطانوی ہند کی تاریخ میں جو منفرد اور امتیازی حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس معاہدے کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ کو اس علاقے کا مختارِ کل تسلیم کیا گیا اور بوقتِ ضرورت برطانوی حکومت اس کو بیرونی جارحیت کے خلاف مدد فراہم کرنے کے لئے پابند ہو گی۔

وریندر گروور معاہدہ امرتسر کی منفرد حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

This treaty stands on a different footing from other treaties with Indian Stat es. The territories of which the Maharaja was recognized as ruler w ere handed over to him in independent possession. While the supremacy of the British Government was acknowledge d, there was no agreement on the part of the Company to guarantee the internal security of the State, Article 9 merely binding the British Authorities to give aid to Maharaja Gulab Singh in protecting his territories from external aggression".

("The story of Kashmir-Yesterday and Today" edit by Verender Grover Vol-I)P-94

اس معاہدے کے تحت دریائے راوی اور دریائے سندھ کے درمیان واقع کشمیر چمبہ، سکردو اور ہزارہ کے علاقے گلاب سنگھ کی عملداری میں دے دیئے گئے۔ یوں خطہ کشمیر انگریزی تسلط میں رہنے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان کا حصہ بننے سے بچ گیا۔

معاہدہ امرتسر کی رو سے گلاب سنگھ نے جو مملکت حاصل کی اس میں کہوٹہ، مری اور ہزارہ کے علاقے جو دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان سلطنت پنجاب سے ملحق تھے، یہ 5 مئی 1847ء کو ایک معاہدہ کے تحت پنجاب کو واپس کر کے اس کے بدلے کھڑی اور مناور کے علاقے سلطنتِ کشمیر میں شامل کر لئے۔

گلاب سنگھ اور اس کے جانشینوں نے معاہدہ امرتسر کے تحت حاصل کیے گئے علاقوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ تبت اور ترکستان کی طرف پیش قدمی کر کے گلگت، بلتستان اور لداخ کے وسیع پہاڑی خطے بھی اپنی مملکت میں شامل کر لئے اور پھر اس مملکت کی حدود کا باقاعدہ تعین کیا۔ یوں 84471 مربع میل پر مشتمل ریاست جموں کشمیر ایک بار پھر دنیا کے نقشے پر ابھر کر سامنے آئی۔

قومی تشخص کی بحالی

مغلوں، افغانوں اور سکھوں نے کشمیریوں کا قومی تشخص چھین کر انہیں غلامی اور ذلت کے ایسے اندھیرے غار میں دھکیل دیا تھا جہاں اُن کی شناخت گم ہو گئی تھی۔ وہ اپنا قومی تشخص بھول کر اپنے آپ کو بیرونی حاکموں کی رعایا خیال کرنے لگے تھے۔ ایسی مجبور، بے بس اور لاچار رعایا جس کو اپنی الگ شناخت کے ساتھ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا، غیر ملکی تسلط نے ان کے قلب و روح کو پامال کر کے دکھ دیا تھا اور ان کے دل و دماغ سے قومی شناخت محو کر دی تھی۔
پنڈت پریم ناتھ بزاز اس صورتحال کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

"By the end of the Sikh Rule the people were thoroughly demoralized. They had become known as *Zulum Parast,* (the worshippers of tyranny). All their old glory, grandeur and heroism had vanished. They were prostrate and at the mercy of an y individual who was put at the helm of affairs by alien kings ruling from the seat of power far away outside the boundaries of the State.

Whatever the Mughals did for the advancement of Kashmir they were, like all imperialists, keen to see that the national spirit of the people of the Valley, which had already been impaired during the rule of later Shahmiris and Chaks is totally shattered. This policy was pursued with redoubled vigour by the Afghans and the Sikhs. Kashmiri armies were disbanded and no man from the Valley was allowed to be recruited in the Afghan or Sikh forces. Consequently the people of the Valley gradually forgot their glorious martial traditions and became timid and coward. The oppression and terrorism that prevailed for more than a century in the country , crushed the people and almost killed their soul. All Kashmiris whether they know anything about their past or not usually remember two things, the greatness of Bud Shah and the bestiality, savagery, cruelty and barbarity of Afghans. The utter disgust of the Afghan rule is not confined to any class or creed; all have it both Hindus and Muslims. "

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''The History of Struggle for Freedom in Kashmir'' صفحہ 120121,)

جدید ریاست جموں کشمیر کی بنیاد

کشمیر کے آزاد و خود مختار سلاطین کے زمانے میں سلطنتِ کشمیر کی سرحدیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لئے کشمیر دنیا کی عظیم سلطنتوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی سرحدیں چینی ترکستان، روسی ترکستان، بدخشاں، کابل، سرحد، بلوچستان، سندھ، مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب پر مشتمل تھیں۔ یہ سرحدیں رفتہ رفتہ سکڑتی چلی گئیں۔ 1586ء میں غیر ملکی تسلط میں آنے کے بعد کشمیر مغلوں افغانوں اور سکھوں کی ''سرکار'' یا ''صوبہ'' بن گیا۔ مغلوں کے قبضے سے لے کر معاہدہ امرتسر (1846ء) تک غیر ملکی طالع آزماؤں نے جو گل کھلائے اور ظلم و جبر کے جو پہاڑ توڑے اس کے نتیجے میں کشمیر کے بحیثیت مملکت یا ریاست قائم رہنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے تھے۔ معاہدہ امرتسر کے نتیجے میں 260 برس بعد جدید ریاست جموں کشمیر کا ظہور عمل میں آیا۔ اسی لئے معاہدہ امرتسر کو جدید ریاست جموں کشمیر کا سنگِ میل اور مہاراجہ گلاب سنگھ کو اس ریاست کا بانی کہا جاتا ہے۔ 1846ء سے 1947ء تک یعنی ایک سو ایک برس تک یہ ریاست متحدہ شکل میں قائم رہی۔

وی پی مینن معاہدہ امرتسر کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معاہدہ امرت سر نے ریاست جموں و کشمیر کو ایک جداگانہ سیاسی حیثیت کا حامل بنا دیا۔ اس معاہدہ کی رو سے گلاب سنگھ مہاراجہ ہو گیا۔ انڈس اور راوی کے درمیان جو کوہستانی علاقہ تھا وہ اس کا مالک بن گیا''۔

(''کشمیر اور جونا گڑھ کی کہانی'' از مسٹر وی پی مینن ترجمہ رئیس احمد جعفری صفحہ 209)

مستحکم حکومت کا قیام

معاہدہ امرتسر کے بعد ڈوگرہ خاندان نے کشمیر میں ایک مستحکم اور پائیدار حکومت کی بنیاد رکھی۔ طویل عرصہ تک غیر ملکی سامراجی تسلط کے زیر انتظام رہنے کے بعد اب ضرورت اس امر کی تھی کہ یہاں ایک مستحکم اور پائیدار حکومت قائم ہو۔ چنانچہ ڈوگروں نے یہاں ایک نہایت مستحکم اور مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی۔ 101 برس کے عرصے میں

چار پشتوں کے چار حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ اس طویل عرصے میں محلاتی سازشوں، اندرونی خلفشار یا اقتدار کے لئے رسہ کشی کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی جس سے اس حکومت کی کمزوری یا نااتفاقی ثابت ہو۔ ایسی مضبوط اور پائیدار حکومت قائم کرنا شاید کشمیر کے اسی خاندان کا کمال تھا۔

علاقائی اور قبیلائی تعصبات کا خاتمہ

مغلوں، افغانوں اور سکھوں کے تسلط میں زندگی گزارنے کے سبب کشمیری معاشرے میں جو بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان میں علاقائی اور قبیلائی تعصبات کی خرابیاں بھی شامل تھیں۔ معاہدہ امرتسر کے نتیجے میں جب ڈوگرہ خاندان نے کشمیر کا اقتدار سنبھالا تو اُنہوں نے ریاست میں اتحاد و یگانگت اور بھائی چارے کی ایسی فضا قائم کی کہ یہاں سے قبیلائی اور علاقائی تعصبات کا خاتمہ ہوگیا۔

کشمیر۔ ایک منفرد ریاست

معاہدہ امرتسر کے نتیجے میں جو جدید ریاست جموں کشمیر معرضِ وجود میں آئی اُسے برطانوی ہند کی دیگر ریاستوں میں کئی حوالوں سے انفرادیت حاصل تھی مثلاً

☆ یہ سب سے بڑی ریاست تھی، جس کا رقبہ 84471 مربع میل تھا۔

☆ فطری حسن اور قدرتی وسائل کے اعتبار سے یہ ریاست مالا مال تھی۔

☆ یہ ریاست آئینی اعتبار سے سب ریاستوں پر فوقیت رکھتی تھی۔

☆ یہ واحد ریاست تھی جس میں ایک آئین ساز اسمبلی موجود تھی جس کے 1947ء سے پہلے تین بار الیکشن ہو چکے تھے۔ (تفصیلات اسی کتاب کے اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ یہ ایک کثیر المذہبی ریاست تھی جس میں مذہبی رواداری کی عمدہ روایات نہایت مستحکم تھیں۔

☆ یہ ایک کثیر النسلی اور کثیر السانی ریاست تھی، لیکن اس میں کبھی نسلی یا لسانی بنیاد پر فتنہ وفساد نہیں ہوا۔

☆ تقسیم ہند کے وقت برطانوی ہند میں 565 شخصی ریاستیں تھیں جنہیں اعلانِ آزادئ ہند کی رو سے اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہو جائیں یا اپنے آپ کو آزاد و خودمختار رکھیں۔ ان ریاستوں میں سے سوائے ایک ریاست کے باقی سب ریاستیں اپنی مرضی ومنشا سے یا جبری طور پر ہندوستان و پاکستان میں مدغم ہوگئیں۔ کشمیر واحد ریاست تھی جو دونوں ملکوں کے جبر و تسلط کا شکار ہونے کے باوجود آج بھی اپنے جداگانہ تشخص اور قومی آزادی کے لئے مصروفِ جدوجہد ہے۔

O

ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن

قیام
مقاصد
سرگرمیاں
خدمات وکردار

پسِ منظر:

ریاست جموں کشمیر کے صوبہ جموں میں مسلمانانِ کشمیر کی فلاح و بہبود اور قومی بیداری کیلئے صوبہ کشمیر کی نسبت بہت پہلے انجمن سازی کا کام شروع ہوا۔ اس زمانے میں چونکہ سیاسی جماعتوں کے قیام کا تصور نہ تھا اور نہ ہی جماعت سازی کی اجازت تھی۔ مطلق العنان ڈوگرہ شاہی کے زمانے میں مسلمانانِ کشمیر کے ساتھ غیر منصفانہ اور امتیازی سلوک کے نتیجے میں مسلمانوں میں احساسِ محرومی پیدا ہوا اور وہ اپنے حقوق کی بازیابی کیلئے تدبیریں کرنے لگے۔ ریاست میں مسلمان بڑی اکثریت ہونے کے باوجود تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے بہت پسماندہ تھے۔ صوبہ جموں چونکہ پنجاب سے ملحق تھا اور اس زمانے میں پنجاب میں بھی مسلمانوں کو مسلم تشخص اور معاشرتی، معاشی مسائل کا سامنا تھا۔ چنانچہ پنجاب کے مسلمانوں نے بھی اپنے حقوق کیلئے کچھ فلاحی تنظیموں کی داغ بیل ڈالی تھی۔ جموں میں اس سلسلے کی پہلی کاوش انجمن اسلامیہ جموں کا قیام تھا۔ 1892ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ یہ پرتاب سنگھ کا دورِ حکومت تھا۔ انجمن نے مسلمانوں کے مکتب اور یتیم خانے قائم کیے۔ حکومت بھی انجمن کو مالی امداد مہیا کرتی تھی۔

ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن کا قیام

انجمن اسلامیہ جموں مسلمانوں کے جائز حقوق اور انکی فلاح و بہبود کے لئے دھیرے دھیرے کام کرتی رہی۔ اس انجمن نے جموں کے نوجوانوں میں ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا۔ انہی چند نوجوانوں نے جن میں ملک مقبول احمد، منشی محمد بشارت، قاضی شمس الدین، مرزا فیروز الدین اور گلزار حسین قمر شامل تھے، 1909ء میں ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔

ایسوسی ایشن کے بنیادی منشور میں حسب ذیل مقاصد تھے:

۱۔ مسلمانوں کو دینِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کو حصولِ تعلیم کی طرف متوجہ کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کی معاشی ومعاشرتی فلاح کے لئے رفاعی کام کرنا۔

ایسوسی ایشن کا دائرۂ کار جموں اور اس کے گرد ونواح تک ہی محدود رہا۔ محدود مسائل اور مختصر تنظیم باعث اس کا دائرۂ کار ریاست کے دیگر حصوں تک نہ بڑھایا جا سکا۔ اس ایسوسی ایشن سے چونکہ کچھ سرکاری ملاز وابستہ تھے، جو اپنی سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایسوسی ایشن کے رفاعی وفلاحی پروگراموں میں بھی حصہ رہتے، لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں کا برانہ مناتی۔ ہندوستان میں تحریک خلافت جب اپنے عروج پر تھی تو ایسوسی ا کے رکن شیخ محمد سعید نے ریاستی سرکار کا ملازم ہونے کے باوجود لاہور کے مقام پر تحریکِ خلافت کے ایک جلسے شرکت کی۔ حکومت نے اس کا سخت نوٹس لیا اور اس ''جرم'' کی پاداش میں موصوف کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ حکومت اس انتقامی کارروائی کے نتیجے میں ایسوسی ایشن کے کارکن بددل ہو گئے اور ان کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کا احیاء

1922ء میں جموں کے چند پڑھے لکھے اور باشعور نوجوان معطل شدہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو از سر نو کرنے کا عزم لے کر اُٹھے۔ یہ نوجوان ملک وقوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان نوجوانوں نے آپس میں ضرور رابطوں کے بعد جموں کے نوجوان شاعر اور ادیب قیس شیروانی (اصل نام شیر محمد خان) کے گھر ایک میٹنگ میں ایسوسی ایشن احیاء عمل میں لایا اور ایسوسی ایشن کی خاطر مخلصانہ کام کرنے کیلئے سات، آٹھ نوجوانوں نے قرآن کریم پر حلف اُٹھایا۔

چوہدری غلام عباس اپنی سوانح عمری ''کشمکش'' میں لکھتے ہیں:

''1922ء کا ذکر ہے، میں ایف۔اے میں پڑھتا تھا کہ ایک دن دو تین دوست میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم معطل شدہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تمہاری شمولیت ہم نے ضروری سمجھی ہے۔ اُنہوں نے میری شرکت شاید اس لئے ناگزیر سمجھی کہ ایک تو اُن دنوں مسلم طلباء کی تعداد بہت کم تھی اور کالج میں جو گنتی کے چند مسلم طلباء تھے اُن کا نصب العین بجا طور پر تحصیل علم تھا اور میری طبیعت بہت حد تک اس کے برعکس تھی۔ علاوہ ازیں رشتہ داروں کی وجہ سے میرا اثر ورسوخ بھی ان کی نگاہ میں تھا۔ بہر حال میں نے بلا تامل اور بے سوچے سمجھے ان سے شرکت کا وعدہ کر لیا..........

اس خفیہ اجلاس میں احباب نے جماعت میں عمل کا رنگ بھرنے اور تادم زندگی، اس کے استحکام اور دوام کیلئے مصروف کار رہنے کی غرض سے حلف اُٹھائے۔ میں نے بھی قرآن کریم پر حلف اُٹھایا۔ مجھے اسوقت معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، لیکن حقیقتاً اس ساعت سے میری آئندہ سیاسی زندگی کا غیر ارادی طور پر آغاز ہو گیا۔ میں ایسوسی ایشن کے کارکنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اُٹھتی جوانی، جذباتی طبیعت، تعلیم سے بے پرواہی۔ جو قومی کام کیلئے مزید معقول بہانہ یا کشش کا موجب تھی اور گھر والوں کی طرف بھی پرسش۔ مل ملا کر ان سب چیزوں نے مجھے ایسوسی ایشن کے کام پر مستعد کر دیا۔ چند دنوں میں ہم نے اس کے سابقہ ''بے ضرر'' اغراض ومقاصد پر نظر ثانی کی۔ حالات کے مطابق اور مسلمانوں کو ایسوسی ایشن کی طرف کھینچنے کیلئے چند ایسے مقاصد رکھے جو عوام کے لئے جاذب نگاہ تھے''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 22)

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کا احیاء عمل میں لانے کیلئے جن نوجوانوں کے اہم کردار ادا کیا، ان میں شیخ عبدالحمید، قیس شیروانی، چوہدری غلام عباس، شیخ غلام قادر، مسٹر اے آر ساغر، عبدالحمید قریشی، غلام حیدر غوری، منشی رحمت اللہ بٹ، منشی غلام علی، بابو طفیل احمد، مولوی رفیع الدین، منشی غلام نبی، پروفیسر عبدالرشید اور خلیفہ عبدالرحیم وغیرہ شامل تھے۔

ینگ مینز ایسوسی ایشن کی ملی خدمات رکردار

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے ریاست جموں کشمیر میں بالعموم اور صوبہ جموں میں بالخصوص مسلمانانِ ریاست کے مذہبی، تعلیمی، معاشی ومعاشرتی حقوق اور اور ان کی سیاسی وقومی شیرازی بندی کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ گو ابتداء میں اس ایسوسی ایشن کے پیشِ نظر رفاعی وفلاحی معاملات تھے، لیکن رفتہ رفتہ اس نے ملکی وسیاسی مسائل کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی نمایاں خدمات حسب ذیل ہیں:

۱۔ فرقہ واریت کی روک تھام

صوبہ جموں چونکہ پنجاب سے ملحق تھا، پنجابی مسلمان مختلف گروہوں، فرقوں اور مسلکوں میں بٹے ہوئے تھے۔ شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث سب ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے۔ چنانچہ اس فرقہ واریت کے اثرات جموں میں بھی پھیل رہے تھے۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے باشعور اور روشن خیال نوجوانوں نے اس فرقہ واریت کے ماحول کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ نوجوان ہر مسلک اور ہر فرقے کے پروگراموں میں شریک ہوتے، سب کا موقف سنتے اور انہیں اپنا موقف سمجھاتے۔

چوہدری غلام عباس اپنی سوانح عمری ''کشمکش'' میں صوبہ جموں کے مسلمانوں سے فرقہ واریت کے خاتمے کے لئے ایسوسی ایشن کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دو، تین سال کی ہماری کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں خود متذکرہ صدر جلوسوں اور جلسوں میں ہر سال التزام کے ساتھ تقریر کیا کرتا تھا اور اب سابقہ حالات کے برعکس حالت یہ تھی کہ اسلامی اتحاد اور سیاسی یگانگت کے مناظر سے جموں کے ہندوؤں کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں اور ان کے دل بیٹھ رہے تھے''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 23)

۲۔ شدھی تحریک کا مقابلہ

اس عرصے میں ہندوستان میں ایک مذہبی ہندو راہنما سوامی شردھانند کی زیر قیادت شدھی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندومت سے مشرف بہ اسلام ہونے والے، مسلمان دوبارہ ہندوازم اختیار کریں۔ تحریک کے مبلغین کا موقف تھا کہ ہندوستان کے ہندوؤں یا بدھوں نے ایک جبر کے ماحول میں اسلام قبول کیا تھا، چونکہ اب جبر کا وہ ماحول نہیں رہا۔ لہٰذا انہیں اسلام چھوڑ کر اپنا پرانا مذہب اختیار کر لینا چاہیے۔ اس تحریک نے ہندوستان میں اتنا زور پکڑا کہ بہت سے مسلمان شدھ ہونے لگے۔ قبل اس کے کہ یہ تحریک ریاست جموں کشمیر کی طرف بھی پھیل جاتی، ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے اس کا بروقت تدارک کرنے کیلئے ہندوستان سے چوٹی کے علماء سے

رابطہ کیا اور جموں میں 16، 17 فروری 1924ء کو ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں ہندوستان سے بھی چوٹی کے
تشریف لائے۔ ان علماء سے مسلم مبلغین ریاست میں بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ مسلم مبلغین نے کئی
جموں میں اپنے تبلیغی مشن جاری رکھے اور مسلمانوں کو شدھی تحریک سے بچایا۔ چوہدری غلام عباس کے بقول:

''ایسوسی ایشن کا یہ اہم کارنامہ ہماری مقبولیت کا پہلا سنگ میل تھا''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ

۳۔ جنازہ گاہ کی تعمیر

جموں میں چونکہ کوئی جنازہ گاہ نہ تھی، اس لئے مسلمانوں کو دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسوسی ایشن نے
حضرات سے چندہ جمع کر کے جنازہ گاہ تعمیر کروائی۔ ایسوسی ایشن کی اس کارگزاری کے نتیجے میں مسلمانانِ جموں
دلوں میں ایسوسی ایشن کا عزت واحترام قائم ہو گیا۔

۴۔ لاوارث مسلم لاشوں کی تدفین

لاوارث مسلم لاشوں کی تجہیز وتکفین کا بندوبست حکومت خود کرتی تھی۔ اس سے بعض اوقات مسلمانوں
تسلی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیا اور لاوارث لاشوں کی تجہ
تکفین تسلی بخش انداز سے ہونے لگی۔

۵۔ پہلے سالانہ جلسے کا انعقاد

1924ء میں ایسوسی ایشن نے اپنے احیاء کے ڈیڑھ برس بعد پہلے سالانہ اجلاس کا پروگرام بنایا۔ اس
قبل ایسوسی ایشن میں سالانہ اجلاسوں کے انعقاد کا رواج نہیں تھا۔ ایسوسی ایشن کا یہ اجلاس جس جوش وجذبے
منعقد ہوا، اس نے جموں کے مسلمانوں میں نیا جوش وجذبہ اور ولولہ پیدا کیا۔ مولانا غلام بھیک نارنگ اور عبد
ودیارتھی کو خصوصی طور پر ہندوستان سے مدعو کیا گیا۔

چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' میں اس جلسے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے سینوں میں ایک غیر مرئی جوش وہیجان پیدا ہو گیا۔ ان کی مدتوں سے
بے حس رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ جلسے کے اختتام پر ایسوسی ایشن کی پوزیشن کو چار چاند
لگ گئے اور کارکنانِ ایسوسی ایشن عوام کی توجہ کا مرکز اور ان کے سیاسی مستقبل کی اُمید بن گئے''۔
(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 29)

۶۔ مسلمانانِ جموں اور پونچھ کی بیداری

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے مسلمانانِ جموں کی بیداری کے لئے جو ابتدائی سفر طے کیا اس کا ذکر کر
ہوئے چوہدری غلام عباس لکھتے ہیں:

''ایسوسی ایشن نے اپنے سالانہ اجلاسوں کے ذریعے مسلمانانِ جموں کے دلوں میں

تھوڑا بہت قومی اور سیاسی شعور پیدا کر دیا۔ وہ اب کم از کم سیاسی نفع ونقصان میں تمیز کرنے کے اہل ہو
گئے اور حکومت کا بے جا اور ناجائز خوف اور رعب بھی قدرے کم ہو گیا''۔
(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 30)

ایسوسی ایشن نے اپنے پہلے کامیاب سالانہ اجلاس کے بعد مسلمانانِ جموں پر اپنا جو تاثر چھوڑا، اس کا نتیجہ
یہ نکلا کہ اس ایسوسی ایشن کے نوجوان مسلمانوں کی اُمیدوں کا مرکز بن گئے۔ ان نوجوانوں نے بھی مستقبل میں اپنے
کندھوں پر قومی وملی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اپنے آپ کو متحد ومنظم کرنا شروع کیا۔ چنانچہ یہ نوجوان جموں
اور اس کے مضافات سے نکل کر اب میرپور، پونچھ اور وادئ کشمیر کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔

کلیم اختر اپنی تصنیف ''شیر کشمیر'' میں لکھتے ہیں:

''اس طرح پونچھ میں تحریک کو جاری کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئیں۔ وہاں پر پہلے ہی اس کارِ خیر کو
چند باہمت نوجوان، جن میں صوبیدار خان محمد خان، مولانا غلام حیدر جنڈالوی، فتح محمد خان کریلوی اور ان کے
رفقاء قابلِ ذکر ہیں، سرانجام دے رہے تھے''۔ (کلیم اختر ''شیر کشمیر'' صفحہ 97-96)

۷۔ سری نگر میں ایسوسی ایشن کی شاخ کا قیام

جموں اور پونچھ میں عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ایسوسی ایشن نے وادئ کشمیر میں بھی اپنا دائرہ کار
بڑھانے کا پروگرام بنایا۔ اگرچہ سری نگر میں شیخ عبداللہ اور ان کے رفقاء ریڈنگ روم کے پلیٹ فارم سے مصروفِ عمل
تھے، لیکن اس تنظیم کا دائرہ محدود ہونے کے سبب وہ ساری ریاست میں ایک پلیٹ فارم سے کام نہیں کر پا رہے تھے۔
چنانچہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن جموں اور ریڈنگ روم سری نگر کے قائدین نے خط وکتابت اور بالمشافہ ملاقاتوں کے
بعد اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کا دائرہ کار وادئ کشمیر تک پھیلایا جائے۔ دونوں تنظیموں
کے مرکزی راہنماؤں شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس نے طے کیا کہ مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد کے اس سفر میں
جموں اور سری نگر کو شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔ چنانچہ سری نگر میں ایسوسی ایشن کی شاخ قائم کی گئی اور اس کا صدر خواجہ غلام
احمد عشائی کو نامزد کیا گیا، جبکہ شیخ محمد عبداللہ بحیثیت جنرل سیکرٹری کام کرنے لگے۔

۸۔ سول سروس ریکروٹنگ رولز کے خلاف احتجاج

1930ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہونے سے قبل تین وزراء
پر مشتمل ایک کابینہ تشکیل دی، جس میں مسٹر ویکفیلڈ، پی کے واتل اور جنرل جنک سنگھ شامل تھے۔ ٹھاکر کرتا سنگھ کو اس
کابینہ کا سیکرٹری بنایا گیا۔ اوّل الذکر دونوں ارکان غیر کشمیری تھے، جبکہ دوسرے دونوں ڈوگرے راجپوت تھے۔
مسلمانوں کا کوئی نمائندہ اس کمیٹی میں نہ لیا گیا۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے اس ناانصافی کیخلاف احتجاج کیا۔
مہاراجہ کی غیر موجودگی میں اس عبوری کابینہ نے سول سروس ریکروٹنگ بورڈ تشکیل دیا، جس نے حصولِ ملازمت کیلئے جو
قواعد وضوابط وضع کیے وہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہ تھے۔ چنانچہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے ان رولز کے

خلاف بھرپور آواز اُٹھائی۔ ایسوسی ایشن نے مسلمان طلباء کو حصولِ تعلیم اور حصولِ ملازمت کیلئے درپیش مسائل کے خلاف جی کھول کر پنجاب کے اخبارات میں مضامین لکھے۔ اس سے ڈوگرہ حکومت کی غیر منصفانہ پالیسیاں بے نقاب ہوئیں۔ اس ضمن میں ایسوسی ایشن کی سری نگر شاخ نے ایک پمفلٹ بھی شائع کیا۔

جسٹس محمد یوسف صراف لکھتے ہیں:

It was atthis stage that a more militant group calling itself the "Muslim ...ngmens' Association" appeared on the scene by circulating a pamphlet entitled ...plica", which contained an exposition of the Service Rules and how it was ...nded to frustrate Muslim aspirations. The pamphlet also announced the ...tence of the secret society and proclaimed that it had been formed to fight for ... rights of Muslims.

(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل صفحہ 357)

۹۔ میڈیا مہم کا آغاز

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے کارکنان نے جب ریاستی مسلمانوں کو درپیش مسائل کو پنجاب کے اخبارات میں موضوع بحث بنایا تو روزنامہ انقلاب، زمیندار، کشمیری اخبار، سیاست، مسلم آؤٹ لُک اور پیسہ اخبار ریاست میں بہت مقبول ہو گئے۔ مولانا عبدالمجید سالک کے اخبار ''انقلاب'' نے بہت مقبولیت حاصل کر لی، کیونکہ یہ اخبار ریاستی مسلمانوں کے مسائل کو سب سے زیادہ کوریج دے رہا تھا۔ چنانچہ حکومت نے فروری 1931ء کو ''انقلاب'' کے خلاف پابندی عائد کر کے اس کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے نوجوان چوری چھپے اس اخبار کے بنڈل جموں لاتے اور وہاں سے پونچھ اور سری نگر ارسال کرتے، جہاں یہ چوری چھپے لوگوں میں فروخت ہوتا۔

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے کارکنوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ''انقلاب'' کے ایڈیٹر مولانا عبدالمجید سالک اپنی تصنیف سرگزشت میں لکھتے ہیں:

''کشمیر میں ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کی مظلومی و کسمپرسی کے خلاف ''انقلاب میں بیشمار مراسلات شائع ہوئے اور بہت سے مضامین لکھے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے اندر تمام پڑھے لکھے لوگ ''انقلاب'' پڑھنے لگے اور رفتہ رفتہ عوام میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ ''انقلاب'' میں اس مہم کا آغاز یوں ہوا کہ اس سے پیشتر ینگ مینز مسلم ایسوسی کے جموں کے بعض کارکنوں نے لاہور میں ایک انگریزی اور ایک اُردو روزنامے میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف مضامین لکھے، چند ہی ہفتوں کے اندر اندر ان اخباروں کے ایڈیٹروں نے چند ٹکوں کی خاطر حکومتِ کشمیر سے رابطہ پیدا کر لیا اور مراسلہ نگاروں کے نام ظاہر کر دیئے، جن پر مہاراجہ کا عتاب نازل ہو گیا اور کارکنوں میں دہشت پھیل گئی۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد جموں کے ایک اخبار نویس دوست لاہور آ کر مجھ سے ملے اور کشمیری مسلمانوں کے دکھ کی داستان سنائی۔ میں نے کہا ''انقلاب'' آپ کی ہر خدمت پر آمادہ ہے، کیونکہ ایک تو ہر مظلوم مسلمان کی حمایت ہمارا فرض ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی رہتا

ہو، دوسرے کشمیری مسلمان ہمارے ہمسایہ اور گوشت پوشت ہیں۔ جب تک کشمیری مسلمان آزادانہ ہو، پنجاب اور صوبہ سرحد اور سندھ کے سیاسی حالات کچھ معنی نہیں رکھتے۔ وہ کہنے لگے ہمیں اندیشہ ہے کہ مبادا ہمیں ''انقلاب'' سے بھی وہی ضرر اُٹھانا پڑے جو ہم اس سے پیشتر فلاں فلاں اخبار سے اُٹھا چکے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے قومی غداری اور صحافتی بددیانتی کی وہ داستان سنائی، جس پر میں نے ان سے کہا کہ آؤ قرآن مجید پر حلف اُٹھائیں۔ تم قسم کھاؤ کہ تم ''انقلاب'' میں جو کچھ لکھو گے یا جو واقعات ایڈیٹر کی اطلاع کے لیے قلمبند کرو گے، ان میں ذرہ بھر بھی جھوٹ یا اشتباہ کی گنجائش نہ ہوگی، بلکہ ہر بات پوری تحقیق کے بعد درج کرو گے۔ اس کے مقابلے میں میں قسم کھاتا ہوں کہ ''انقلاب'' کے دفتر یا میرے قبضے سے تمہاری کسی تحریر کا ایک لفظ بھی مہاراجہ کے پاس اُس کے حکام تک نہ پہنچ سکے گا۔ میں دس لاکھ روپیہ پر بھی لات ماروں گا اور جیل خانہ میں جانا گوارا کروں گا، لیکن کسی قومی کارکن یا اپنے کسی نامہ نگار کا راز فاش نہ کروں گا''۔

(عبدالمجید سالک ''سرگزشت'')

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے پُرجوش نوجوانوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے منشی معراج الدین احمد اخبار ''پاسبان'' میں لکھتے ہیں:

''یکم نومبر 1931ء کو مسٹر اے۔ آر۔ ساغر 30 رضا کاران ینگ مینز ایسوسی ایشن کو لے کر سول نافرمانی کی مہم کو روانہ ہوئے۔ ادھر انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور اُدھر معزز جریدہ ''انقلاب'' لاہور کے پرچے رضا کاروں کے ہاتھوں میں بلند ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ریاست میں اسلامیان ہند کے دو ممتاز ترین روزناموں انقلاب اور سیاست کا داخلہ بند تھا اور مسٹر ساغر نے تحریکِ آزادی کشمیر کو تیز کرنے کیلئے سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ یکم نومبر کا دن براہِ راست ڈوگرہ سامراج سے ٹکرا جانے کا دن تھا۔ مسٹر ساغر کو مع ان کے ساتھیوں کے گرفتار کر لیا گیا''۔

(''پاسبان'' یکم نومبر 1961ء ایڈیٹر منشی معراج الدین احمد سیالکوٹ)

پروفیسر محمد سرور عباسی اپنی تصنیف ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' میں رقمطراز ہیں:

''انقلاب پر بندش کے باوجود مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک نے ثابت قدمی دکھائی اور نئے ڈیکلریشن لے کر یکے بعد دیگرے ''کشمیری مسلمان''، ''مظلوم کشمیر'' اور ''مکتوبِ کشمیر'' کے نام سے پرچے نکالے۔ یہ سب ہفتہ وار اخبار تھے، جو کشمیریوں کی مظلومیت کے نقیب بن گئے۔ جونہی یہ اخبارات جموں میں پہنچائے جاتے تو ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے کارکن انہیں دیگر شہروں تک پھیلا دیتے تھے''۔

(پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 67)

۔ جموں میں جلسۂ عام کا انعقاد:

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے 19 ستمبر 1930ء کو تالاب کھٹیکاں کی مسجد میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ ...جلسے کو مسلمانانِ جموں کا پہلا سیاسی جلسہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں چوہدری غلام عباس، سردار گوہر رحمٰن، اللہ رکھا

ساغر، گل محمد اور دیگر قائدین نے تقاریر کیں اور قراردادیں پاس کروائیں، جن میں مسلمانوں کے لئے ملازمتو پچاس فیصد کوٹہ مختص کرنے، ریکروٹنگ بورڈ میں مسلمان نمائندے شامل کرنے اور پنجاب کے اخبارات سے پا اُٹھانے کے مطالبات شامل تھے۔ اس جلسہء عام سے مسلمانانِ جموں میں خاصا جوش وخروش پیدا ہوا اور حکوم خلاف ان کے جذبات بھڑک اُٹھے۔

اس جلسے کے انعقاد کے بعد ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن سے وابستہ نوجوان مسلمانانِ جموں کی امی محور ومرکز بننے لگے۔ 1922ء میں ایسوسی ایشن کے احیاء کو اب آٹھ برس گزر رہے تھے۔ ان برسوں میں ایسوی نے مذہبی، معاشرتی اور رفاعی سطح پر جو خدمات سرانجام دیں تھیں ان سے نہ صرف اس ایسوسی ایشن کا مسلمانو دلوں میں عزت ووقار بڑھا تھا بلکہ اب اس کے قابل اور مخلتی نوجوان اپنی شبانہ روز محنت سے اس قابل ہو چکے مسلمانوں کی مجتمع قوتوں کو جمع کر کے اُنہیں طاقت مہیا کریں جو ڈوگرہ راج کی بساط لپیٹنے کے قابل ہو سکے۔

چوہدری غلام عباس ایسوسی ایشن کی ان کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی وہ سالہ کوشش پیہم سے مسلمان مرض الموت کی زد سے نکل چکے تھے اور اب بستر علالت چھوڑ کر مصروف عمل ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ قدرت نے ایک قابل طبیب کی طرح ان کی نبض پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ کب قدرت مریض کی تندرستی کا فتویٰ صادر کرتی ہے۔ جب کہ فتویٰ آخرکار 1931ء میں بندش خطبہ اور توہین قرآن کی صورت میں صادر ہو گیا تو جہادِ آزادی کا طبل آناً فاناً بج گیا اور ایسا معلوم ہوا گویا اس طبل کی آواز پر لبیک کہنے کیلئے آسمانوں سے فرشتے اتر آئے ہیں۔ کفر وشرک ار ظلم وتعدی کے تمام کل پرزے حرکت میں آگئے''۔

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 47)

2 اپریل 1931ء کو جموں کے شالیمار باغ میں نماز عید کی ادائیگی کے بعد جب مفتی محمد اسحٰق عید کا خط رہے تھے تو ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس انسپکٹر بابو کھیم چند نے امام صاحب کو خطبہ دینے سے روک دیا۔ اس تاریخ میں موجود ایک عینی شاہد میر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

''2 اپریل 1931ء عیدالضحیٰ کا دن تھا۔ مسلمان نماز عید پڑھنے کے لیے شہر کے مشہور ''شالیمار'' میں جمع تھے۔ میری عمر اس وقت بارہ سال کے لگ بھگ تھی اور میں بھی اپنے تایا محترم میر حسین بخش (مرحوم) (مرحوم) بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی میر عبدالسنان کے ساتھ تیسری صف میں بیٹھا تھا۔ جامع مسجد کے خطیب اسحاق صاحب مرحوم خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ کے دوران مفتی صاحب نے ان تمام جانوروں کے نام لینا شر جن کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ بے خیالی سے ان کے منہ سے ''گائے'' کا نام بھی نکل گیا۔ گائے کا نام لینا ہی تھا پر موجود ایک ہندو پولیس آفیسر ''کھیم چند'' کو غصہ آ گیا اور آپے سے باہر ہو کر نہایت تحکمانہ وگرج دار آ برلا'' مولوی صاحب لیکچر بازی فوراً بند کرو۔ آپ لوگ نماز پڑھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، نماز پڑھیں اور

لیں'' لوگ دم بخود تھے اور میدان میں ایک سکوت طاری تھا۔ مولوی صاحب کو بحالت مجبوری خطبہ روکنا پڑا اور وہ بیٹھ گئے کراتنے میں جلالی طبیعت کے مالک میرے تایا (میر حسین بخش) جو بڑے قدآور، صحت مند، باحوصلہ اور نڈر قسم کے بزرگ تھے۔ بڑے جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس گستاخ پولیس آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے گرج کر کہنا شروع کیا'' انسپکٹر ہوش میں آجاؤ جانتے ہو تم مداخلت فی الدین کے مرتکب ہو رہے ہو۔ مسلمان ہر ظلم برداشت کر سکتا ہے مگر مذہب اور دین میں مداخلت کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ سلامتی چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ مسلمانوں کا یہ ہجوم اگر بپھر گیا تو تمہاری تکہ بوٹی کر دے گا۔'' اس پر مسلمانوں میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی ایک شور اٹھا۔ انسپکٹر نے لوگوں کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو چپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔ تایا صاحب نے مفتی صاحب کو خطبہ جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ خطبہ پھر سے شروع ہو گیا۔'' (میر عبدالقیوم''اب منزل دور نہیں''،ص 17,18)

بندش خطبہ کے اس واقعہ سے مجمع میں زبردست اشتعال پھیل گیا اور اُنہوں نے اسے مداخلت فی الدین قرار دے کر زبردست احتجاج کیا۔ اس موقعہ پر ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن نے بھرپور کردار ادا کیا اور اس روز جلسہ عام کا انعقاد کیا، جس کی صدارت میر حسین بخش نے کی۔ اس واقعہ کی بھرپور مذمت کی گئی اور مسلمانوں کی دینی غیرت کے تحفظ کا عزم کیا گیا۔ جلسہ سے میر حسین بخش، سردار گوہر رحمٰن، مستری یعقوب علی اور چوہدری غلام عباس وغیرہ نے تقریریں کیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ جموں کی تحصیل سانبہ کے گاؤں ڈگھور میں پیش آیا۔ عید کے روز ہندوؤں نے مسلمانوں کو تالاب سے پانی لینے سے روک دیا۔ مسلمان وضو کیلئے پانی نہ حاصل کر سکے تو ان میں اشتعال پھیل گیا۔ اس واقعہ کے ردعمل میں بھی جموں میں زبردست احتجاج ہوا۔ ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن کے نوجوان اس احتجاج میں پیش پیش تھے۔

توہینِ مذہب کا تیسرا بڑا واقعہ سنٹرل جیل جموں میں پیش آیا، جہاں میرپور سے تعلق رکھنے والا ایک پولیس سپاہی فضل داد خان ڈیوٹی کے اوقات میں پنج سورہ سرہانے پر رکھ کر تلاوت کر رہا تھا کہ ہندو سب انسپکٹر لبھو رام نے اسے ڈانٹا، سرہانے کو ٹھوکر مار کر نیچے گرا دیا تو پنج سورہ بھی زمین پر آن گرا۔ فضل داد خان نے ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن کو ایک درخواست لکھ کر اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ ایسوسی ایشن نے اس واقعہ کا سخت نوٹس لیا اور ریاست بھر میں اس کی تشہیر کی۔

توہین مذہب کے پے در پے مذکورہ بالا دلخراش واقعات نے ریاست بھر میں مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب وانتقام کی زبردست لہر پیدا کر دی۔ جموں میں حکومت مخالف مظاہروں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن کی اپیل پر سری نگر، پونچھ اور میرپور وغیرہ میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ ایسوسی ایشن نے ان واقعات کی مذمت اور مسلمانوں کو ڈوگرہ حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کیلئے سیالکوٹ سے اشتہارات شائع کروا کر ریاست کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں چسپاں کروائے۔

جسٹس محمد یوسف صراف لکھتے ہیں:

"Hundreds of copies of the posters published by the Youngmen's Muslim Association Jammu were sent to Sheikh Muhammad Abdullah for distribution. In Srinagar, a volunteer, Muhammad Ismail, was caught by the

police, while affi xcing a poster and put in Jail. According to Pandit Bazaz, he was the first political prisoner of the Movement".

(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل صفحہ 365)

ریاستی وزیرِ اعظم سے ایسوسی ایشن کے وفد کی ملاقات:

جموں میں توہینِ مذہب کے مذکورہ بالا واقعات سے حالات کشیدہ ہو گئے۔ مسلمان سخت اضطراب میں تھے۔ چنانچہ مہاراجہ ہری سنگھ بیرونِ ملک سے واپس پہنچا تو اُس نے فوری کارروائی کیلئے ریاستی وزیرِ اعظم مسٹر ویکفیلڈ کو 8 جون 1931ء کو جموں بھیجا۔ جموں میں مسلم قائدین کے کئی وفود وزیرِ اعظم کو ملے۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کا ایک وفد بھی وزیرِ اعظم سے ملا اور اُسے صحیح حالات و واقعات سے آگاہ کر کے مسلمانوں کی جائز شکایات کے ازالے کی درخواست کی۔ مسٹر ویکفیلڈ نے دو تین روز تک تحقیقات جاری رکھیں اور توہینِ مذہب اور توہینِ قرآن کے واقعات کو اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا۔

نمائندہ وفد کی سری نگر روانگی:

حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے وزیرِ اعظم نے مسلم نمائندگان کے ایک وفد کی مہاراجہ ہری سنگھ سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ چنانچہ سری نگر اور جموں کے سرکردہ نمائندگان کو سری نگر بلایا گیا۔ جموں سے چار نمائندگان کا وفد جولائی 1931ء کے اوائل میں سری نگر پہنچا۔

اس وفد میں مستری یعقوب علی، سردار گوہر رحمٰن، چوہدری غلام عباس اور شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ شامل تھے۔ اس وفد کا سری نگر میں پرتپاک استقبال کیا گیا۔ یہ وفد سری نگر کے عمائدین سے ملکر ابھی مہاراجہ کو پیش کیے جانے والے مطالبات وتجاویز کی تیاری میں مصروف تھا کہ 13 جولائی 1931ء کو وہ عظیم سانحہ رونما ہوا، جس کے نتیجے میں تحریک حریت ایک نئے دور میں داخل ہوئی اور بائیس مسلمانوں کی شہادت نے تحریک حریت کشمیر کو نئے موڑ میں داخل کر دیا (13 جولائی 1931ء کے سانحہ کی تفصیل اس کتاب کے اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں)۔ انہی واقعات کے نتیجے میں ریاست بھر کی مسلم قیادت سر جوڑ کر بیٹھی اور سیاسی جدوجہد کیلئے 1932ء میں آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے سیاسی تنظیم عمل میں آئی۔

خلاصہ کلام:

ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے ڈوگرہ عہد حکومت میں ریاست جموں کشمیر کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے اندر مذہبی، سماجی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کیلئے اہم کردار ادا کیا۔ ان خدمات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے صوبہ جموں میں سماجی فلاح و بہبود کے کاموں کو منظم اور مربوط انداز سے شروع کیا۔

۲۔ ایسوسی ایشن نے مسلمانوں کو اپنی حالت بدلنے کے لئے حصولِ تعلیم کی طرف راغب کیا۔

۳۔ ایسوسی ایشن نے ریاستی مسلمانوں کے مسلم تشخص کو پامال ہونے سے بچایا۔

۴۔ ایسوسی ایشن نے مسلمانوں کو فرقہ واریت سے دور رکھنے کی کوشش کی اور اُنہیں باہمی اتحاد و اتفاق کی طرف راغب کیا۔

۵۔ ایسوسی ایشن نے شدھی اور سنگھٹن کا راستہ روک کر ریاستی مسلمانوں کو فتنہ ارتداد سے بچایا۔

۶۔ ایسوسی ایشن نے ریاستی مسلمانوں کے ساتھ ڈوگرہ حکمرانوں کے ناروا سلوک کو بیرونِ ریاست اُجاگر کرنے میں جدوجہد کی۔

۷۔ ایسوسی ایشن نے جموں کشمیر کے مسلمانوں میں سیاسی شعور اُجاگر کیا۔

۸۔ ایسوسی ایشن نے ریاستی مسلمانوں کو سیاسی حقوق کی جدوجہد کیلئے سیاسی جماعت کے قیام کی طرف متوجہ کیا۔

۹۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی جہدِ مسلسل کے نتیجے میں صوبہ جموں سے ایسی مسلم قیادت اُبھری، جس نے جدوجہدِ آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس قیادت میں سردار گوہر رحمٰن خان، میر حسین بخش، مستری یعقوب علی، شیخ عبدالحمید، چوہدری غلام عباس، اے آر ساغر، غلام حیدر غوری، عبدالمجید قریشی، حبیب کیفوی، قیس شیروانی، عالم خان، شیخ غلام قادر، شیخ عبدالعزیز، سید غلام حیدر، شیخ مولا بخش، مولوی محمد حسین، منشی معراج الدین احمد، صاحبزادہ عبدالرحمٰن، منشی غلام علی، رحمت اللہ بٹ، شیخ غلام غوث، منشی محمد صادق، منشی طفیل محمد، شیخ محمد امین، محمد امین شاہ، منشی غلام علی، غلام حیدر چشتی، بابو گل محمد، ماسٹر غلام حیدر، غلام سرور اور میاں محمد ابراہیم شامل تھے۔

O

3 ریڈنگ روم

قیام

سرگرمیاں

خدمات و کردار

9 مئی 1930ء کو تحریک آزادیٔ کشمیر میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ دن ہے جب سرینگر کے چند اعلیٰ تعلیمیافتہ نوجوانوں نے اپنی صلاحیتوں کو ملک وقوم کے بہتر مفاد کی خاطر بروئے کار لانے اور ریاستی مسلمانوں کو اپنے حقوق وفرائض کا شعور عطا کرنے کیلئے محلہ زینہ کدل میں شیخ محمد اسمٰعیل کے مکان سے ملحقہ ایک کمرے میں READINGROOM (دارالمطالعہ) کے نام سے ایک مرکز قائم کیا۔

ریڈنگ روم کا قیام عمل میں لانے میں جن تعلیمیافتہ اور باشعور نوجوانوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل نوجوان سرفہرست تھے۔ بلاشبہ علی گڑھ کے مخصوص تعلیمی وتربیتی ماحول نے ان نوجوانوں کی کردارسازی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ 12 اپریل 1930ء کو علی گڑھ سے ایم ایس سی کیمسٹری کی ڈگری لے کر آئے۔ یہ ریاست جموں کشمیر میں پہلے ایم ایس سی نوجوان تھے۔ ان کے کچھ اور ساتھی مسٹر محمد رجب ایم اے ایل ایل بی تھے، قاضی سیف الدین بی اے بی ٹی تھے اور غلام احمد مختار ایم اے بی ٹی تھے۔ یہ سب ایک ساتھ علی گڑھ سے فارغ ہو کر آئے تھے۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے دیگر تعلیمی اداروں سے بھی کچھ نوجوان فارغ ہو کر اپنے وطن واپس آ چکے تھے۔ زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی انگریز راج کے خلاف سیاسی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ اپنے زمانہ طالبعلمی میں یہ نوجوان علامہ اقبال، علی برادران، محمد علی جناح، گاندھی اور موتی لعل نہرو جیسی سحر انگیز شخصیات کو بہت قریب سے دیکھ چکے تھے اور ان کی جدوجہد سے اثر لے چکے تھے۔ اگرچہ یہ نوجوان ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے لیکن ہند کی تحریک آزادی نے انہیں اپنے مادر وطن جموں کشمیر میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور ڈوگرہ راج کے خلاف اقدامات کے بارے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نوجوانوں کی اسی سوچ وبچار کے نتیجے میں ریڈنگ روم کا قیام عمل میں آیا۔

ریڈنگ روم کو منظم خطوط پر استوار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر مسٹر محمد رجب اور سیکرٹری جنرل شیخ محمد عبداللہ منتخب ہوئے۔ دیگر اراکین میں حاکم علی، پیرزادہ غلام رسول، پیرزادہ احمد شاہ فاضلی، حکیم غلام مرتضیٰ، منشی جلال الدین، مولوی عبدالرحیم، غلام نبی گلکار، قاضی سیف الدین اور مسٹر بشیر احمد شامل تھے۔

اغراض ومقاصد اور سرگرمیاں

ریڈنگ روم کے قیام کا بنیادی مقصد وادیٔ کشمیر کے پڑھے لکھے بیروزگار نوجوانوں کو اپنے مسائل

مشکلات کی خاطر سوچ وبچار کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ علی گڑھ اور پنجاب سے تعلیم حاصل کر کے آنیوالے یہ نوجوان اپنے مستقبل کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ اسی فکر نے انہیں مل بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ ان نوجوانوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مخیر حضرات سے چندہ جمع کر کے 82 روپے جمع کیے اور ہندوستان سے شائع ہونے والے کچھ اخبارات اپنے دفتر کے لئے لگوا لئے۔ اس ریڈنگ روم میں دن بھر پڑھے لکھے نوجوان مصروف مطالعہ رہتے۔ ان کے دیکھا دیکھی سرینگر کی کچھ مذہبی، سماجی اور کاروباری شخصیات بھی یہاں آنے لگیں۔ بظاہر تو ریڈنگ روم میں نوجوان مل بیٹھتے اور اخبارات ورسائل یا کتب وغیرہ کا مطالعہ کرتے، لیکن رفتہ رفتہ اخبار بینی اور مطالعہ کی یہ نشستیں فکری نشستوں میں بدلنے لگیں اور نوجوان عالمی مسائل، ریاستی حالات وواقعات اور ریاستی مسلمانوں کی بدحالی پر بھی غور وفکر کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد اس ریڈنگ روم کو زینہ کدل سے فتح کدل میں مفتی جلال الدین کے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ بعد ازاں اس ریڈنگ روم کو "ریڈنگ روم فتح کدل" کا نام دیا گیا۔

ریڈنگ روم کے اغراض ومقاصد کے بارے ڈاکٹر سلام الدین نیاز اپنی تصنیف "ان کہی داستان کشمیر" میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ ریڈنگ روم بظاہر اخبار بینی اور مطالعہ کتب کے لئے معرض وجود میں آیا تھا، لیکن اس کا اصل کام مسلمانوں کو منظم کرنا تھا"۔ (ڈاکٹر سلام الدین نیاز "ان کہی داستان کشمیر" صفحہ 148)

پروفیسر سرور عباسی اپنی تصنیف "کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی" میں لکھتے ہیں۔

"اس مٹھی بھر جماعت (ریڈنگ روم) میں زیادہ فعال، بلند حوصلہ اور متحرک شیخ محمد عبداللہ ہی تھے۔ سیاسی سرگرمیوں کی ابتداء میں ہی انہوں نے ہر قسم کے آرام وآسائش کا خیال ترک کر دیا تھا۔"

(پروفیسر محمد سرور عباسی "کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی" صفحہ 64)

شیخ عبداللہ اپنے ایک انٹرویو میں ان ایام کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

"میں اکثر بھوک لگنے سے پانی سے روٹی کھا لیتا تھا اور جہاں جگہ ملتی سو رہتا تھا"

(انٹرویو شیخ عبداللہ "شبستان ڈائجسٹ" دہلی خصوصی شمارہ 1968 صفحہ 53)

شیخ عبداللہ مزید بتاتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ ریڈنگ روم کے باہمی رابطے نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف کشمیر کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ریڈنگ روم کے اراکین کو "ریڈنگ روم پارٹی" کے نام سے موسوم کیا جانے لگا"۔ (انٹرویو شیخ عبداللہ "شبستان ڈائجسٹ" دہلی خصوصی شمارہ 1968 صفحہ 53)

ریڈنگ روم کے ایک بانی رکن مولوی عبدالرحیم اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

"ریڈنگ روم چل نکلا تو یہ تعلیمیافتہ مسلمانوں کے لئے باعث کشش بن گیا۔ وہ جب مل بیٹھتے تو سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے فقدان اور ملکی معاملات پر گفتگو کرتے۔ اخبارات اور کتب بینی کے ساتھ ساتھ

مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا بھی ریڈنگ روم میں تذکرہ ہوتا اور اراکین مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتے۔

(پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 64)

ریڈنگ روم سے وابستہ تعلیم یافتہ، مخلص اور محنتی نوجوانوں نے تھوڑے ہی عرصے میں سرینگر کی سما[ج] میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور یہ نوجوان عوامی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اسی اثناء میں ریڈنگ روم کے ایک مرکزی کار[کن] محمد عبداللہ کو سرکاری سکول میں ایک سائنس ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ سرکاری ملازم ہونے کے باو[جود] صاحب نے ریڈنگ روم سے اپنا تعلق استوار رکھا۔ ان نوجوانوں نے ریاستی مسلمانوں کو درپیش مسائل و مشکلات [پر غور] وفکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو بہت کم نمائندگی دی گئی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے [ریاستی] حکومت کے اس غیر مساویانہ سلوک کا پردہ چاک کرنے کیلئے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے با[رے میں] مختلف محکموں سے شواہد جمع کیے اور اس رپورٹ کو ہندوستان کے اخبارات میں شائع کروانے کا پروگرام بنایا۔

جسٹس محمد یوسف صراف اپنی گرانقدر تصنیف Kashmiri's Fight for Freedom میں رقمطراز ہیں۔

The plans that some of them had envisaged while at Aligarh now began to take shape. Having succeeded in setting up a base camp in the shape of the Reading Room, they began establishing contact with Muslim newspapers at Lahore.

(جسٹس محمد یوسف صراف، Kashmiri's Fight for Freedom، جلد اوّل صفحہ 355)

شیخ محمد عبداللہ اپنی سوانح حیات ''آتشِ چنار'' میں لکھتے ہیں۔

''ہم نے کشمیریوں اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں کے ابتر حالات کے متعلق دنیا کو باخبر کرنے کے لئے ابتدائی کوششوں کا آغاز کیا۔ ہم نے لاہور سے چھپنے والے اُردو اخبارات کو مراسلے بھیجے اور اس کے علاوہ لندن سے شائع ہونے والے روشن خیال جریدے ''انڈین سیکس'' کے مدیر جنی پام دت سے بھی رابطہ قائم کر لیا اور پہلی بار کشمیر کے حالات کا تاریک پہلو دنیا کے سامنے آ گیا۔ ان دنوں ایک ممتاز مہمان جو ہمارے ریڈنگ روم میں تشریف لائے۔ کلکتہ کی جامع مسجد کے خطیب مولانا آزاد سبحانی تھے۔ مولانا حریت پسند تھے اور حریت نواز بھی۔ اُنہوں نے ہماری مشاورت کو سراہا اور ہمیں ایک عوامی تحریک شروع کرنے کی ترغیب دی۔ جب حکومت کے کانوں اس رابطے کی بھنک پڑی تو اس نے مولانا کی تلاش شروع کر دی، لیکن اس وقت تک وہ ریاست کی حدود سے باہر جا چکے تھے۔ البتہ اس نے حکومت کو ریڈنگ روم پارٹی کی سرگرمیوں پر کڑی نگرانی رکھنے پر اُکسایا''۔

(شیخ محمد عبداللہ ''آتشِ چنار'' صفحہ 48،49)

انہی دنوں مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن چلے گئے۔ اُنہوں [نے] روانگی سے قبل نظامِ ریاست کی دیکھ بھال کیلئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس میں مسٹر ویکفیلڈ، پی کے واٹل اور جنرل [جنک] سنگھ کو رکھا گیا۔ کوئی مسلمان اس کمیٹی میں شامل نہیں تھا۔ اس کمیٹی نے سول سروس کیلئے ''سول سروس ریکروٹنگ [بورڈ'']' تشکیل دیا۔ اس بورڈ نے جو قوانین بنائے اُس سے تعلیمیافتہ مسلمانوں کیلئے سرکاری ملازمت کا حصول مشکل ہو گیا۔

جسٹس یوسف صراف لکھتے ہیں۔

"It was a strange coincidence that with the return of Sheikh Mohammad Abdullah and other graduates from Aligarh, the Civil Service Recruitment Board, which had been recently setup, framed certain rules, which do appear to have been intended to prevent the entry of Muslims

Sixty percent vacancies were to be filled in by the Government without any reference to the Board; as to the remaining forty percent, every candidate was required to deposit a sum of rupees fifty as fee, the maximum age for recruitment was fixed at 22 years and it was also made obligatory for an applicant to possess a "good family background" and even if a Mussalman was lucky enough to cross all these hurdles, the Government reserved the right to reject him without assigning any reasons whatsoever. It was felt that the devices were invented to give a legal cover to the policy of denying them due representation. It is also interesting to point out that almost the entire group of unemployed Muslim graduates or double graduates was above 22 years of age and, therefore, clearly stood debarred from recruitment to any respectable service."

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد اوّل صفحہ 355)

ان رولز کے خلاف ریڈنگ روم کے نوجوانوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اُنہوں نے مذکورہ بالا کمیٹی کو مشترکہ دستخطوں سے ایک یادداشت ۱۱ ستمبر ۱۹۳۰ء کو بھیجی جس پر دو ایم ایس سی، چار ایم اے یا بی اے ایل ایل بی، دو بی اے، بی ٹی اور سات بی اے پاس نوجوانوں کے دستخط تھے۔ یہ یادداشت خواجہ غلام احمد عشائی نے لکھی۔ اس کے نتیجے میں کمیٹی کے سیکرٹری ٹھاکر کرتار سنگھ نے ریڈنگ روم کے وفد کو مذاکرات کے لئے بلایا۔ شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں۔

''حکومت نے دیکھا کہ مسلمان سخت ترین مشکلات کے باوجود تعلیم میں ترقی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس نے محسوس کیا کہ خیر اسی میں ہے کہ کسی طرح ان تعلیمیافتہ نوجوانوں پر مزید قیود عائد کر کے اُنہیں حکومت میں کسی قسم کا بھی حصہ نہ لینے دیا جائے۔ اس لئے اس مقصد کو لے کر سول سروس ریکروٹنگ بورڈ کا ڈھونگ رچایا گیا۔ نوجوان مسلمانوں نے میری سرکردگی میں اس بورڈ کی مخالفت کی۔ ایک عرضداشت کابینہ وزارت میں پیش کی۔ ایک وفد بھی جس میں میرے دوست عبدالعزیز بی اے ایل ایل بی بھی تھے، کابینہ وزارت سے ملا اور اس پر ریکروٹنگ بورڈ کے نقائص بالتفصیل واضح کیے، لیکن وفد کو قابل وزراء نے جو جواب دیا وہ حد درجہ حوصلہ شکن تھا۔ بس یہیں سے تعلیمیافتہ مسلمانوں میں خصوصاً اور عام مسلمانوں میں عموماً بے چینی پیدا ہو گئی''۔

(کلیم اختر ''شیرِ کشمیر'' انٹرویو شیخ محمد عبداللہ صفحہ 80-81)

ریڈنگ روم سے وابستہ نوجوانوں نے سول سروس ریکروٹنگ بورڈ کے ظالمانہ قوانین کے خلاف خفیہ اور اعلانیہ انداز سے مہم شروع کی۔ اس سلسلے میں پنجاب کے اخبارات میں ریاستی صورت حال پر مضامین شائع ہونے لگے جو حکومت وقت کی ظالمانہ پالیسیوں کو طشت از بام کرنے لگے۔ حکومت نے جب صورت حال کو قابو سے باہر ہوتے ہوئے دیکھا تو اخبارات کا ریاست میں داخلہ بند کر دیا۔ مسلم حقوق کا ترجمان ''سیاست'' تو پہلے ہی ممنوع قرار دیا جا چکا

تھا۔اب 'انقلاب' اور ''مسلم آؤٹ لک'' پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ان پابندیوں نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر ان حالات میں ریڈنگ روم اور اس کے نوجوان مسلمانانِ ریاست کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

ریڈنگ روم کے روحِ رواں شیخ محمد عبداللہ تھے۔حکومت کا ملازم ہونے کے باوجود وہ ریاستی حقوق کے لئے تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔انہی ایام میں صوبہ جموں میں توہینِ قرآن اور خطبہ بندش کے واقعات پیش آئے، جنہوں نے ریاست بھر کے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر پیدا کردی۔شیخ عبداللہ گئے اور وہاں وہ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے کارکنان چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھیوں سے ملے نوجوانوں نے طے کیا کہ آئندہ جموں اور سرینگر میں ہونیوالی تمام سرگرمیوں میں باہمی رابطہ پیدا کیا جائے گا دوسرے کے شانہ بشانہ ڈوگرہ حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف جدوجہد کی جائے گی۔

چوہدری غلام عباس اپنی سوانح عمری ''کشمکش'' میں لکھتے ہیں۔

''شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر پہنچتے ہی ایسوسی ایشن کی طرح ڈالی اور ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے جلسوں اور تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کردیا''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 53)

ریڈنگ روم کوئی سیاسی جماعت یا عوامی پارٹی نہیں تھی۔لیکن اس گروہ سے وابستہ نوجوان چونکہ آ مسلم تشخص کی بحالی اور عوامی حقوق کی بازیابی کیلئے ہونے والے جلسے جلوسوں اور اجتماعات میں شرکت کرتے ر تھے۔یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان دنوں ریاست جموں کشمیر میں کوئی سیاسی جماعت یا عوامی پلیٹ فارم موجود اور نہ ہی حکومتی منظوری کے بغیر عوامی اجتماعات یا جلسوں وغیرہ کی اجازت تھی۔ریڈنگ روم کے نوجوان چونکہ ہر قسم سماجی، مذہبی یا حکومت مخالف پروگراموں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔اس لئے عوام الناس انہیں ''ریڈنگ روم پار کے نام سے پکارنے لگے۔

1931ء کا واقعہ ہے۔مہاراجہ ہری سنگھ گول میز کانفرنس سے واپس آنے لگا تو ریاست میں مہاراجہ کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔لوگوں کے اندر جوش وخروش تھا، کیونکہ مہاراجہ اپنے ساتھ اپنے نومولود بچے یوراج کر سنگھ کو بھی لے کر آرہا تھا۔سرکار پرست اور جاگیردار اس استقبال میں پیش پیش تھے۔ریڈنگ روم نے اسے خوشامدا استقبال قرار دیا اور اعلان کیا کہ ریڈنگ روم پارٹی خود مہاراجہ کا استقبال کرے گی اور اس استقبال کے موقع پر مہاراج اپنے حقوق اور مطالبات بھی پیش کیے جائیں گے۔اس سلسلے میں خواجہ نبی گلکار، خواجہ عبدالغنی، خواجہ ثناء اللہ خان، خواجہ احمد اور خواجہ عتیق اللہ وغیرہ نے سرخ سیاہی سے قلمی پوسٹر لکھ کر شہر کے مرکزی مقامات پر لگادیے۔ان اشتہارات میں حقوق کی بحالی کے مطالبات درج تھے۔ریڈنگ روم نے جامع مسجد سرینگر میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔مگر حکومت نے امتناعی نوٹس جاری کرکے جلسہ روکنے کا حکم دے دیا۔حکومت کی طرف سے جاری ہونے والے حکم امتناعی کو توڑنے کیلئے ریڈنگ روم نے خواجہ غلام نبی گلکار کو ڈکٹیٹر مقرر کیا، جس نے مقررہ دن کو پر جوش تقریر کی او حکومتی نوٹس کی دھجیاں بکھیر دیں۔اس موقع پر شیخ عبداللہ نے مولانا عبدالحمید سالک کی نظم پڑھی۔

تمہی سے اے مجاہدو جہاں کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

اس عرصے میں صوبہ جموں میں یکے بعد دیگرے توہینِ مذہب کے تین واقعات رونما ہوئے۔ان میں پہلا واقعہ 29 اپریل 1931ء کو شالیمار باغ جموں میں پیش آیا، جہاں ایک پولیس انسپکٹر بابو کھیم چند نے مفتی محمد اسحٰق کو نمازِ عید کا خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔دوسرا واقعہ جموں کی تحصیل سانبہ کے گاؤں ڈگھور میں پیش آیا، جہاں اسی عید کے روز ہندوؤں نے مقامی مسلمانوں کو تالاب سے پانی بھرنے سے منع کردیا۔تیسرا واقعہ 4 جون 1931ء کو سنٹرل جیل جموں میں پیش آیا، جہاں ایک ہیڈ کانسٹیبل لبھو رام نے مسلمان کانسٹیبل فضل داد خان کو پنج سورہ کی تلاوت سے منع کیا اور پنج سورہ زمین پر جا گرا۔

ان واقعات کے خلاف ریاست بھر میں مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا۔وادئ کشمیر میں بھی ان واقعات کے خلاف آئے روز جلسے جلوس ہونے لگے۔سرینگر کے مذہبی قائدین میرواعظ مولانا یوسف شاہ اور میرواعظ احمد اللہ ہمدانی ان مظاہروں کی قیادت کرتے۔شیخ عبداللہ، مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار ان مظاہروں میں پیش پیش تھے۔ریڈنگ روم کے کارکنوں نے شہر میں احتجاجی اشتہارات چسپاں کیے۔یہی اشتہارات چسپاں کرتے ہوئے محمد اسمٰعیل نامی ایک نوجوان گرفتار ہوگیا جو تحریک حریت کشمیر کا پہلا سیاسی قیدی قرار پایا۔محمد اسمٰعیل کی گرفتاری سے شہر میں غم وغصہ پھیل گیا۔ہجوم نے شیخ عبداللہ کی قیادت میں پولیس اسٹیشن کی طرف مارچ شروع کیا۔چنانچہ پولیس نے محمد اسمٰعیل کو رہا کردیا۔یہ واقعہ 8 جون کو پیش آیا۔اس واقعہ کے بعد سرینگر میں آئے روز جلسے جلوس ہونے لگے۔ریڈنگ روم سے وابستہ نوجوان ان جلسوں کا اہتمام کرتے۔

21 جون 1931ء کو خانقاہ معلی میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا، جس میں کم وبیش پچاس ہزار مرد وخواتین نے شرکت کی۔اس جلسے کی صدارت میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ اور میرواعظ احمد اللہ ہمدانی نے کی جبکہ مقررین میں شیخ عبداللہ، خواجہ غلام احمد عشائی، مولوی عبدالرحیم، خواجہ غلام نبی گلکار اور مفتی جلال الدین شامل تھے۔ شیخ عبداللہ نے قرآن پاک ہاتھ میں لے کر اعلان کیا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی قوم کی خدمت میں بسر کریں گے۔

حکومت مخالف جلسوں اور مظاہروں میں شیخ عبداللہ کی شرکت حکومت کو ناگوار گزری۔حکومت نے شیخ عبداللہ کو سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے ان سرگرمیوں سے باز رہنے کی ہدایت کی، لیکن شیخ عبداللہ نے ان احکامات کی کوئی پرواہ نہ کی۔حکومت نے انہیں انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے مظفرآباد ٹرانسفر کردیا۔نتیجتاً شیخ عبداللہ ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور میدان کارزار میں کود پڑے۔کلیم اختر لکھتے ہیں۔

''شیخ عبداللہ کی قربانی اور جرأت سے عوام بے حد متاثر ہوئے اور وادئ کشمیر کے سب لوگ ان کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے۔ان حالات کو جب کشمیر کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا میرواعظ نے دیکھا تو انہوں نے بھی شیخ عبداللہ کی حمایت کا اعلان کردیا اور وادئ کشمیر اسلام زندہ باد اور ماسٹر عبداللہ زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی''۔

(کلیم اختر ''شیر کشمیر'' صفحہ 86)

نتائج وثمرات

اپنے قیام کے مختصر عرصے میں ہی ریڈنگ روم نے سیاساتِ کشمیر میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ ملاز مستعفی ہونے کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور ریڈنگ روم کے کچھ دیگر رفقاء کھل کر میدانِ سیاست میں کود پڑے۔ وادی کے سیاسی، سماجی اور مذہبی رہبروں کے ایک خصوصی اجلاس میں میرواعظ مولانا یوسف شاہ نے تجویز پیش کی کہ عبداللہ کو قوم کا متفقہ لیڈر منتخب کر لیا جائے۔ اُنہوں نے سامعین سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

''آج سے شیخ عبداللہ ہمارے، آپ کے، سب کے اور کشمیری عوام کے متفقہ لیڈر ہیں۔ ان کی ہر بات میری اور پوری قوم کی بات ہے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ان کی دی ہوئی ہدایات اور بتائے ہوئے پروگرام کو ہمیشہ اور ہر حالت میں عملی جامہ پہنایا کریں''۔ (ڈاکٹر سلام الدین نیاز ''ان کہی داستانِ کشمیر صفحہ 158)

یہ حقیقت ہے کہ میرواعظ مولانا یوسف شاہ کا حکم وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں کے لئے حرفِ آخر کا تھا۔ اُنہوں نے جب علی الاعلان شیخ عبداللہ کو اپنا اور اپنی قوم کا لیڈر قرار دیا تو پھر ہر طرف شیخ عبداللہ کے چرچے لگے۔ شیخ عبداللہ کے میدانِ سیاست میں اُترنے سے سیاساتِ کشمیر جو مذہبی و سماجی پردوں کی آڑ میں جموں، میر پونچھ وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت میں بہہ رہی تھی، سب نے ملکر ایک بڑے دریا کا روپ دھار لیا۔ ایام میں پونچھ، جموں اور میرپور میں کچھ ایسے سانحات رونما ہوئے، جنہوں نے مسلمانانِ ریاست جموں کشمیر کو کر بیٹھنے کی دعوت دی اور مسلمانوں نے اپنے حقوق کی جدوجہد کی خاطر ایک سیاسی جماعت کے قیام کی ضرورت کی۔ چنانچہ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 1932ء میں ''آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس'' کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل عمل میں آئی۔

ریڈنگ روم نے سیاساتِ کشمیر میں جو نتائج وثمرات حاصل کیے اُنہیں مختصراً یوں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ ریڈنگ روم نے پڑھے لکھے نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔

۲۔ تعلیمیافتہ نوجوانوں نے لوگوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور عطا کیا۔

۳۔ ریڈنگ روم نے ڈوگرہ راج کی ظالمانہ پالیسیوں کا پردہ چاک کیا۔

۴۔ ریڈنگ روم نے بیرونِ ریاست پریس کو ریاستی حالات و واقعات سے باخبر کیا۔

۵۔ ریڈنگ روم نے مسلمانانِ ریاست کے حقوق کے تحفظ کا علم بلند کیا۔

۶۔ ریڈنگ روم نے ریاست کے دیگر حصوں میں مصروفِ عمل سماجی و مذہبی تنظیموں کے مابین تال میل پیدا

۷۔ ریڈنگ روم نے مسلمانانِ کشمیر کو مشترکہ سیاسی جدوجہد کی راہ پر گامزن کیا۔

۸۔ ریڈنگ روم کے پلیٹ فارم سے پڑھی لکھی سیاسی قیادت ابھر کے سامنے آئی جس نے تحریک آزا کشمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

13 جولائی یومِ شہدائے کشمیر

پسِ منظر

13 جولائی کا سانحہ

اہمیت وافادیت

13 جولائی 1931ء کا دن تحریکِ حریتِ کشمیر میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو تاریخِ کشمیر میں ایسے بیشمار واقعات ملتے ہیں جب ریاستی عوام نے غیر ملکی تسلط کے خلاف یا پھر اپنے ہی ہم وطنوں کے ظلم و جبر کے خلاف صدائے حریت بلند کی اور پھر اس جرم کی پاداش میں اُنہیں قید و بند کی صعوبتیں یا جان و مال کی قربانی پیش کرنا پڑی۔ 13 جولائی 1931ء کا واقعہ بھی ایسے ہی سرفروشوں کی یادگار ہے جنہوں نے دینی غیرت و حمیت اور ملی جذبے سے سرشار ہو کر دیوانہ وار جانوں کے نذرانے پیش کیے اور تحریکِ حریتِ کشمیر میں اپنا لہو شامل کر کے اس داستان آزادی کو لہو سے رقم کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری قوم ہر سال 13 جولائی کا دن ''یوم شہدائے کشمیر'' کے حوالے سے مناتی ہے اور 1931ء کے 22 شہیدوں کو بالخصوص اور لاکھوں شہیدوں کو بالعموم خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس عزم کا اعادہ کرتی ہے کہ جب تک ظلم، جبر، استحصال اور غلامی سے پاک ایک آزادانہ، منصفانہ اور فلاحی معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آ جاتا اس وقت تک کشمیری عوام کی یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

آیئے 13 جولائی 1931ء کے اس خونین واقعہ کی تفصیلات اور تحریکِ حریتِ کشمیر میں اس کی اہمیت و افادیت بااثرات ونتائج کا جائزہ لینے سے پہلے ذرا اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ یہ عظیم سانحہ کیوں پیش آیا یا اس کے پس منظر میں کونسے محرکات کارفرما تھے۔

پسِ منظر:

ریاست جموں کشمیر میں سال 1931ء کے اوائل میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کے نتیجے میں مسلمانانِ ریاست کی دینی و ملی غیرت کو سخت دھچکا لگا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جب تک وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے یا خوابِ غفلت میں ڈوبے رہیں گے، ان کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حقوق آئے روز پامال ہوتے رہیں گے اور ان کا ضامن کوئی نہیں ہوگا۔ 1931ء کا سال مسلمانانِ کشمیر کیلئے سیاسی بیداری کا سال بھی کہلاتا ہے۔ اس سال جولائی سے قبل پیش آمدہ واقعات اس بیداری کا سبب بنے۔ چند نمایاں واقعات حسب ذیل ہیں:

بندشِ خطبہ :

29 اپریل 1931ء کو عیدالاضحیٰ کا دن تھا۔ جموں کے مسلمان نمازِ عید کی ادائیگی کیلئے میونسپل کمیٹی باغ... تھے۔ مفتی محمد اسحٰق خطبہ دے رہے تھے۔ دورانِ خطبہ جب اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعونِ مصر کے ذکر چھیڑا تو ڈیوٹی پر موجود پولیس انسپکٹر لالہ کھیم چند اشتعال میں آگیا اور اُس نے آگے بڑھ کر مفتی صاحب کو خطبہ دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ امام صاحب نے خطبہ روک دیا۔ عیدگاہ میں موجود مسلمانوں میں اشتعال پھیل گیا۔ مسلمانوں نے نہایت بے چینی سے نماز ادا کی۔ نمازِ عید کی ادائیگی کے بعد مسلمان سراپائے احتجاج بن گئے۔ اسی روز ینگ مینز... ایسوسی ایشن جموں کے زیرِ اہتمام جامع مسجد میں بندشِ خطبہ کے اس واقعہ کے خلاف احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ اس کی صدارت میر حسین بخش نے کی۔ سردار گوہر رحمٰن خان، شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ، چوہدری غلام عباس اور دیگر مقررین نے جلسے سے خطاب کیا اور حکومت پر کڑی تنقید کی۔ جلسے میں قراردادیں پیش کی گئیں، جن میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت مداخلت فی الدین سے باز رہے اور کھیم چند پر توہینِ مذہب کا مقدمہ چلایا جائے۔ بندشِ خطبہ کی یہ خبر جب ریاست کے دیگر علاقوں میں پہنچی تو وہاں بھی مسلمانوں کو دکھ اور صدمہ پہنچا۔

ڈگھور میں تصادم:

جموں کی تحصیل سانبہ کے گاؤں ڈگھور میں ہندو اور مسلمان ایک ہی تالاب سے پانی بھرتے تھے۔ عید... روز ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم ہوگیا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو تالاب سے پانی بھرنے سے منع کر دیا۔ پولیس نے مداخلت کی اور مسلمانوں کو تالاب سے پانی لینے سے روک دیا اور تالاب سے متصل جگہ میں نمازِ عید کی ادائیگی بھی روک دیا۔ اس واقعہ کے خلاف جموں میں ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن اور انجمن اسلامیہ جموں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔

توہینِ قرآن کا پہلا واقعہ :

4 جون 1931ء کو سنٹرل جیل جموں میں میرپور سے تعلق رکھنے والا ایک مسلمان کانسٹیبل فضل داد خان ا... کے اوقات میں اپنے بستر پر بیٹھا پنج سورہ کی تلاوت کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر لبھو رام آیا تو اُس نے فضل داد کو برا بھلا کہا... اس کا سرہانہ کھینچ کر فرش پر دے مارا۔ اس سے پنج سورہ بھی زمین پر جا گرا۔ فضل داد نے اپنے سینئر حکام کے پاس لبھو رام کے خلاف شکایت کی، لیکن جب اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی تو اُس نے ایک تحریری درخواست ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن جموں کو پیش کی۔ 6 جون کو ایسوسی ایشن کی اپیل پر جموں شہر میں مسلمانوں نے ہڑتال کی۔ شام کو تالاب کھٹیکاں میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں توہینِ قرآن کے اس واقعہ کی شدید مذمت کی گئی۔ جموں میں اس واقعہ کیخلاف کئی روز تک جلسے جلوس ہوتے رہے۔ اس واقعہ کی اطلاع جب ریاست کے دوسرے حصوں میں پہنچی تو وہاں کے مسلمانوں نے احتجاج کیا۔

توہینِ قرآن کا دوسرا واقعہ :

توہینِ قرآن کا دوسرا واقعہ 20 جون کو سرینگر میں پیش آیا۔ قرآنِ پاک کے مقدس اوراق ایک پبلک لیٹرین سے ملے۔ اس واقعہ کے خلاف وادی میں مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ میرواعظ مولانا یوسف شاہ اور ریڈنگ روم کے نوجوانوں نے احتجاجی مظاہرے کیے اور واقعہ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

توہینِ مذہب کے مذکورہ بالا پے در پے واقعات نے مسلمانانِ ریاست جموں کشمیر کی دینی و ملی غیرت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ان واقعات کے نتیجے میں جموں، میرپور، پونچھ اور سرینگر میں حکومت مخالف احتجاجی مظاہروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریاستی تاریخ میں ایسے مظاہروں کی مثال کبھی نہیں ملتی۔ پنجاب میں مسلم اخبارات و رسائل اور مسلم قائدین بھی ان واقعات سے پوری طرح باخبر تھے۔ مسلمانوں کے ترجمان اخبارات ''انقلاب''، ''سیاست'' اور ''مسلم آؤٹ لک'' وغیرہ نے ان خبروں کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور مسلمانوں کے ردِعمل کو ہندوستان بھر سے منظرِ عام پر لایا۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ مسلمانانِ کشمیر کی تائید و حمایت میں ہندوستان کے کچھ حصوں میں بھی جلسے جلوس ہوئے۔

صوبہ جموں میں بگڑتی ہوتی صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے وزیرِاعظم ویک فیلڈ جموں آیا، وہاں اس نے مسلم نمائندگان کے وفد سے 9 جون کو ملاقات کی۔ اس وفد میں چوہدری غلام عباس، اے آر ساغر اور دیگر راہنما شامل تھے۔ ان راہنماؤں نے وزیرِاعظم کو اپنے مطالبات پیش کیے۔ وزیرِاعظم نے ان مطالبات کو بغور سنا اور مسلمانوں کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اس نے مسلمان راہنماؤں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ان کا ایک نمائندہ وفد مہاراجہ ہری سنگھ سے بھی ملاقات کرے۔

صوبہ کشمیر میں بھی ان واقعات کے خلاف سخت غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی سرینگر شاخ اور ریڈنگ روم فتح کدل سے وابستہ نوجوانوں نے متحرک کردار ادا کیا۔ ایسوسی ایشن نے سیالکوٹ سے اشتہارات شائع کروا کرائے جنہیں شیخ محمد عبداللہ، مولوی عبدالرحیم اور غلام نبی گلکار نے رات کی تاریکی میں شہر میں چسپاں کیا۔ دوسرے روز تحریک کا ایک کارکن محمد اسمٰعیل دن کے وقت اشتہار چسپاں کر رہا تھا کہ اسے ریاستی پولیس نے گرفتار کر لیا۔ محمد اسمٰعیل کی گرفتاری کے خلاف شیخ عبداللہ کی قیادت میں ایک عظیم الشان احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے پولیس نے محمد اسمٰعیل کو رہا کر دیا۔ یہی محمد اسمٰعیل تحریکِ حریت کشمیر کا پہلا سیاسی قیدی کہلاتا ہے۔

وادی میں دو ممتاز مذہبی شخصیات میرواعظ مولانا یوسف شاہ اور میرواعظ احمد اللہ ہمدانی عوامی حلقوں میں گہرا اثر رکھتے تھے۔ اس احتجاجی تحریک میں جب یہ حضرات بھی شامل ہوگئے تو تحریک نے ایک طوفانی رخ اختیار کر لیا۔ اسی اثناء میں شیخ محمد عبداللہ کو سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا گیا، کیونکہ وہ بڑھ چڑھ کر اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کی ملازمت سے برطرفی اس تحریک کیلئے جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ شیخ صاحب کھل کر میدانِ عمل میں کود پڑے۔

خانقاہِ مُعلّیٰ میں اجتماع :

21 جون 1931ء کو خانقاہِ معلّیٰ میں مسلمانانِ کشمیر کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا۔ اس تحریک کا یہ پہلا جلسہ تھا، جس میں 50 ہزار افراد شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں بچے اور عورتیں بھی بڑی تعداد میں شامل تھیں۔ اس اجتماع کی صدارت میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور احمد اللہ ہمدانی نے کی، جبکہ مفتی جلال الدین، شیخ محمد عبداللہ، خواجہ غلام احمد عشائی، مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار نے تقاریر کیں۔ اس موقع پر شیخ عبداللہ نے نہایت جذباتی تقریر کی اور قرآن پاک ہاتھ میں اُٹھا کر تحریک سے وفادار رہنے کا حلف بھی اُٹھایا۔ آخر میں مہاراجہ ہری سنگھ سے مجوزہ ملاقات کیلئے سات رکنی وفد کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ اس میں خواجہ سعد الدین شال، میر واعظ مولانا یوسف شاہ، میر واعظ احمد اللہ ہمدانی، آغا سید حسین شاہ جلالی، خواجہ غلام احمد عشائی، مفتی شہاب الدین اور شیخ محمد عبداللہ شامل کیے گئے۔ جموں سے چار مسلم نمائندے پہلے ہی اس وفد کے لئے منتخب ہو چکے تھے۔ ان میں مستری یعقوب علی، سردار گوہر رحمٰن، چوہدری غلام عباس اور شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ شامل تھے۔

جونہی یہ جلسہ ختم ہوا۔ تمام مسلمان راہنما چائے پینے چلے گئے۔ لوگ ابھی منتشر نہیں ہوئے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان سٹیج پر چڑھا اور تقریر کرنے لگا۔ اس کی تقریر کا لب لباب یہ تھا:

''مسلمانو اب وقت آ گیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے، یادداشتوں اور گزارشوں سے، ظلم و ستم میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور نہ ہی توہینِ قرآن کا مسئلہ حل ہوگا۔ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور ظلم کے خلاف ڈٹ جاؤ''۔

اس نے راج محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس محل کی اینٹ سے اینٹ بجادو''۔

اس اجنبی کی تقریر جذبات سے بھری ہوئی تھی، جس سے مسلمانوں میں بے پناہ جوش و جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ نوجوان تقریر ختم کر کے فوراً وہاں سے روپوش ہو گیا۔ شام کے وقت پولیس نے اسے بغاوت یا انتشار پھیلانے کے الزام میں نسیم باغ کے ایک ہاؤس بوٹ سے گرفتار کر لیا۔ ☆۱

عبدالقدیر کی اصلیت سے کوئی آدمی آگاہ نہیں تھا۔ وہ بظاہر مسلمان تھا اور اس نے مسلمانوں کی ہمدردی کی بات کی تھی، اس لئے جب اس کی گرفتاری کی خبر مسلمانوں نے سنی تو انہیں شدید دکھ ہوا۔ مسلمان رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ عبدالقدیر کے مقدمے کی پیروی وہ خود کریں گے۔ اس سلسلے میں مولوی محمد عبداللہ ایڈووکیٹ، پیر قمر الدین اور مسٹر غلام محمد پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی۔ عبدالقدیر کی رہائی کے لئے احتجاجی جلسے بھی شروع ہو گئے۔ چونکہ ریاست میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیاسی مقدمہ تھا، اس لئے لوگوں کی اس میں دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ عبدالقدیر کو جب جیل سے عدالت

☆۱۔ دورانِ تحقیقات یہ بات سامنے آئی کہ اس اجنبی نوجوان کا نام عبدالقدیر ہے اور یہ امروہہ یوپی کا رہنے والا پٹھان ہے۔ یہ ایک انگریز فوجی آفیسر میجر Butt کے ساتھ خانساماں کے روپ میں سرینگر آیا ہوا تھا۔ مکمل تحقیقات کے بعد ثابت ہوا کہ عبدالقدیر برٹش انٹیلی جنس کا ایک اہلکار تھا، جسے اشتعال دینے یا بغاوت پھیلانے کی تربیت دے کر انگریز آفیسر کے ہمراہ سرینگر بھیجا گیا تھا کیونکہ ان دنوں سرینگر کا ماحول خاصا گرم تھا۔

میں لایا جاتا تو لوگوں کا جم غفیر اس کے ساتھ چلتا اور پولیس کی حفاظت میں بھی اس کے ہاتھ اور کپڑے چوم چوم کر اس سے اظہار ہمدردی کرتے۔

انہی دنوں مہاراجہ ہری سنگھ گول میز کانفرنس سے واپس وطن پہنچا۔ اُس نے اپنی غیر موجودگی میں پیش آمدہ حالات و واقعات پر سخت غم و غصے اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے مذکورہ بالا افسوسناک واقعات کا ذمہ دار حکومت کے متعلقہ افراد کو ٹھہرایا اور اُنہیں سزا کا مستحق قرار دیا۔ اس نے 9 جولائی کو ایک اعلان جاری کیا۔ ''میرا مذہب انصاف ہے، میرے رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ انسان میرے پاس براہ راست آزادی سے آسکتے ہیں اور میری رعایا کو جو شکایات ہوں وہ میرے پاس پیش کر سکتے ہیں''۔ مہاراجہ نے مسلمانوں کی جاری کردہ تحریک کو بیرونی مداخلت کا نتیجہ قرار دیا اور کہا ''میری بالکل خواہش نہیں ہے کہ اپنی رعایا کی جائز معروضات اور آواز کو چاہے وہ تحریری ہو یا زبانی، روکا جائے'' اس نے ان شرائط کی پابندی لازمی قرار دی۔

۱۔ سیاسی تحریک چلاتے وقت ملکی قانون کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

۲۔ بیرونی مداخلت کو کسی قسم کا موقع نہ دیا جائے۔

مہاراجہ نے بیرونی عناصر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''آپ لوگ میری ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریں، جیسا کہ میں آپ کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا''۔

12 جولائی کو گاؤ کدل میں ایک جلسۂ عام ہوا، جس میں مقررین نے عبدالقدیر کے خلاف ہونے والی کارروائی کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ عبدالقدیر کے مقدمے کی سماعت جیل کے بند کمرے میں نہ کی جائے بلکہ یہ سماعت عدالت کے کھلے احاطے میں کی جائے۔ اگلے روز یعنی 13 جولائی کو عبدالقدیر کے کیس کی سماعت تھی، چنانچہ مقررین نے عوام سے درخواست کی کہ وہ کل صبح سنٹرل جیل کے باہر پہنچ جائیں۔ یہ جلسہ رات بارہ بجے اختتام پذیر ہوا۔

13 جولائی 1931ء کا دن :

13 جولائی 1931ء کو صبح سویرے سیکڑوں مسلمان سنٹرل جیل سرینگر کے باہر جمع ہو گئے۔ یہ جیل میں عبدالقدیر کے مقدمے کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ جونہی سیشن جج پنڈت کرشن لال کچلو جیل کے دروازے پر پہنچا، بہت سے لوگ اس کی گاڑی کے ساتھ جیل میں داخل ہو گئے۔ جج نے عبدالقدیر کے وکیل مولوی عبداللہ کو ہدایت کی کہ وہ لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کریں اور انہیں کہیں کہ وہ جیل کے احاطے سے نکل جائیں۔ چنانچہ لوگ جیل کے احاطے سے نکل کر جیل کے صدر دروازے کے باہر جمع ہو گئے اور عدالتی کارروائی کا انتظار کرنے لگے۔ دن کے ایک بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ترلوک چند موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی پولیس کو حکم دیا کہ جن لوگوں نے جیل میں داخل ہونے کی کوشش کی ہے انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ یہ حکم ملتے ہی پولیس نے کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ پولیس کی اس کارروائی کیخلاف لوگ مشتعل ہو گئے اور عبدالقدیر کے حق میں اور حکومت کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ لوگ مشتعل

ہو کر قیدیوں کو چھڑانے کیلئے دوبارہ جیل کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہونیکی کوشش کرنے لگے۔ پولیس نے آکاؤ فائرنگ شروع کردی، جس کے نتیجے میں 17 افراد موقع پر دم توڑ گئے۔ جبکہ چالیس افراد شدید زخمی ہو گئے۔ زخمیوں میں سے 5 افراد بعدازاں جامع مسجد میں دم توڑ گئے۔ اس طرح اس واقعہ میں کل 22 افراد شہید ہوئے۔

شہدا کی فہرست حسب ذیل ہے:

نمبر شمار	نام	عمر	رہائش
۱	غلام محمد حلوائی	۲۵سال	جامع مسجد
۲	عبدالخالق شورہ	۳۳سال	وازہ پورہ
۳	غلام نبی کلوال	۲۷سال	پائدان
۴	غلام محمد صوفی	۲۰سال	دھری بل
۵	غلام قادر بٹ	۲۲سال	محلہ بہان دین
۶	محمد رمضان	۱۹سال	خانیار
۷	محمد عثمان	۲۰سال	کلاشپورہ
۸	غلام محمد نقشبندی	۲۲سال	کانی کدل
۹	غلام رسول درزی	۲۳سال	احمد اکدل
۱۰	امیر جو	۲۷سال	گوجوارہ
۱۱	عبدالاحد	۲۳سال	گاؤ کدل
۱۲	غلام احمد قال باف	۳۲سال	فتح کدل
۱۳	امیر جو مکائی	۳۵سال	نواکدل
۱۴	شعبان جو مکائی	۶۰سال	نواکدل
۱۵	سبحان خان	۲۲سال	نواب بازار
۱۶	عبدالخالق	۳۰سال	واتل کدل
۱۷	محمد اکبر	۳۳سال	ڈال وگر
۱۸	عبدالقادر	۲۶سال	بہاؤالدین
۱۹	غلام رسول ڈورا	۲۷سال	گوٹاپورہ
۲۰	احمد راتھر	۳۰سال	نوشادرہ
۲۱	احمد ڈار	۳۰سال	نوشادرہ
۲۲	ولی رانی	۵۰سال	بٹہ پورہ

(جسٹس محمد یوسف صراف ''Kashmiri's Fight for Freedom'' جلداول صفحہ 279،278)

13 جولائی کو سنٹرل جیل کے باہر جب مجمع عام پر گولی چلائی گئی، اس وقت سیکڑوں لوگ وہاں موجود تھے، لیکن کوئی بھی نمایاں لیڈر اس روز وہاں نہ آیا۔ مشتعل ہجوم نے پولیس کے رہائشی کوارٹرز کو آگ لگادی۔ انہوں نے آس پاس سے چارپائیاں اکٹھی کیں اور شہدا اور زخمیوں کو ان پر ڈال کر ان کے خون آلود کپڑوں کو لہراتے ہوئے ایک جلوس کی شکل اختیار کرلی۔ یہ جلوس آہ وفریاد کرتے ہوئے اور قرآن پاک کی آیات کا ورد کرتے ہوئے جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا، لوگ اُمڈ اُمڈ کر اس کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد سارا سرینگر آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گیا۔ چوہدری غلام عباس جو اس سانحہ کے وقت سرینگر شہر میں ہی تھے، لیکن جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھے، اپنی سوانح عمری ''کشمکش'' میں لکھتے ہیں:

''13 جولائی 1931ء دن کے دو بجے کے قریب میں ایک دوست کے ساتھ امیرا کدل کے بازار میں کھڑا تھا۔ ہم یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ مجھ پر کچھ پژمردگی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں کے اندر ساری فضا غبار آلود ہوگئی اور اندھیرا چھا گیا۔ پہلے تو فضا کا یہ رنگ دیکھ کر گمان ہوا کہ موسلا دھار بارش ہونے والی ہے۔ میں قیام گاہ کی طرف جانے ہی والا تھا کہ اچانک آندھیاں گھر گھر کر آگئیں۔ ساری فضا زمین سے لے کر آسمان تک گرد وغبار کا ایک تودہ مجسم بن گئی۔ کیفیت یہ ہوگئی کہ میں اپنے ساتھی کو بھی جو مجھ سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر تھا دیکھ نہ سکتا تھا......''

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 60)

شہدا کا یہ جلوس مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جامع مسجد سرینگر پہنچا۔ اس وقت تک تقریباً سارا سرینگر شہر اس جلوس میں شامل ہو چکا تھا۔ شیخ عبداللہ، چوہدری غلام عباس اور دیگر مسلمان راہنما واقع کی اطلاع ملتے ہی جامع مسجد پہنچ آئے، جہاں تمام شہدا کی لاشیں رکھی گئی تھیں۔ حکومت نے شہر میں کرفیو لگادیا اور جگہ جگہ فوج تعینات کردی۔ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس سمیت تمام مسلمان راہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ کل 326 لوگ گرفتار کیے گئے۔ شہر میں خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ دوسرے روز بھی شہدا کی لاشوں کی تدفین نہ ہو سکی۔ بالآخر 15 جولائی کو قبرستان نقشبند میں ان شہدا کو ایک ہی احاطے میں دفن کیا گیا اور اس کا نام ''مزار شہدا'' رکھا گیا۔ وادیٔ کشمیر میں اس واقعہ کے خلاف 17 روز ہڑتال رہی، جس سے تمام کاروبار حکومت معطل ہو کر رہ گیا۔ دفاتر بند ہو گئے، ٹرانسپورٹ رک گئی اور گلیاں، بازار سنسان ہو گئے۔ جموں سرینگر شاہراہ کئی روز تک سنسان رہی۔

13 جولائی - اہمیت وافادیت

13 جولائی کا واقعہ تحریک آزادیٔ کشمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کو تحریک آزادیٔ کشمیر میں وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوستان کی تحریک میں جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو حاصل ہے۔ اس واقعہ کو تحریک آزادیٔ کشمیر کا نقطہ آغاز بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ سے پہلے تحریک آزادی سہمی سہمی اور خوفزدہ تھی۔ اس کے گرد مصلحتوں اور مفادات کے پہرے لگے ہوئے تھے۔ یہ یاداشتوں اور گذارشوں کی حد تک محدود تھی، لیکن اب اس میں نئی جان اور نئی روح پیدا ہوگئی تھی اور یہ نئے عزم وولولے کے ساتھ اٹھی تھی۔ اب یہ تحریک آہ وفغاں اور نالہ وفریاد کے

دور سے نکل کر سرفروش و سربکف ہوگئی تھی۔ ایک ایسی قوم جس کی کم ہمتی اور بزدلی مثال بنتی جا رہی تھی۔ اس نے اس تا[illegible] کو آنِ واحد میں جھٹک دیا اور سروں پر کفن باندھ کر شہادت کے رجز گانے لگی۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھ لیں گے، زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ظالمانہ اور جابرانہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اور عزت و آزادی کی صبحِ بہاراں کا منظر دیکھنے کے لئے لہو کے نذرانے دینا پڑتے ہیں اور سروں کی فصل کٹانا پڑتی ہے۔ وطن اور قوم کی خاطر دی گئی یہ قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں، بشرطیکہ ان قربانیوں کا تسلسل جاری رکھنے والے اور شہیدوں کے مشن کے حقیقی وارث زندہ ہوں۔ 13 جولائی کے عظیم سانحے میں دم توڑتے ہوئے ایک مجاہد نے شیخ محمد عبداللہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہی پیغام دیا تھا۔

''شیخ عبداللہ! ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اب آگے بڑھنا آپ کا کام ہے''

شیخ عبداللہ اپنی سوانح عمری ''آتش چنار'' میں لکھتے ہیں:

''13 جولائی کو کشمیری عوام پر فائرنگ ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ ہر گولی نے میری چھاتی میں سوراخ کر دیا ہے۔ اس فائرنگ کے بعد ہی میری عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اس فائرنگ میں بیشمار افراد زخمی ہو گئے۔ میں ایک زخمی کو سنبھال رہا تھا کہ اس نے دم توڑتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ عبداللہ! میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اب آگے بڑھو اور میں آگے بڑھنے لگا''۔ (شیخ محمد عبداللہ ''آتش چنار'' صفحہ 56)

13 جولائی کے ان 22 شہیدوں نے عزم و ہمت اور جرأت و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے لئے جو تابندہ روایت قائم کی تھی۔ اس کی ایک گواہی اس وقت کے ریاستی وزیر اعظم مسٹر ویکفیلڈ نے شہیدوں کا معائنہ کرنے کے بعد یوں دی تھی۔

''ان جوانوں کی بہادری پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ گولیاں سب نے سینوں پر کھائی ہیں۔ پشت پر کسی آدمی نے بھی گولی نہیں کھائی''۔

(ویکفیلڈ ''Recollections'')

پنڈت پریم ناتھ بزاز 13 جولائی کے واقعہ کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Historically and politically the 13th July, 1931, is the most important day in the annals of contemporary Kashmir. From this day the struggle for independence and freedom in the most modern sense started openly. Doubtless in 1931, the struggle was aggressively communal outwardly but those who had not kept their eyes shut could see that i t was in essence the struggle of a victimized and enslaved people against the

despotic rule. It was sooner or later bound to proceed on the right track".

(پنڈت پریم ناتھ بزاز "The History of Struggle for Freedom in Kashmir'' صفحہ 154)

پنڈت پریم ناتھ بزاز اپنی دوسری تصنیف میں لکھتے ہیں:

''13 جولائی کا واقعہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے تاریخ کشمیر کا ایک عظیم ترین سانحہ ہے۔ تنگ نظر اور فرقہ پرست ہندوؤں نے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس مظاہرے کا پس منظر ثابت کرتا ہے کہ اس عوامی شورش کی تہہ میں جو جذبہ کام کر رہا تھا، وہ آزادی کی تڑپ اور ڈوگرہ سامراج کے خلاف نفرت تھی۔ لہٰذا ہجوم نے جیل پر شورش کی۔ اسے ہندوؤں پر حملہ ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مظاہرین اگرچہ سارے کے سارے مسلمان تھے، مگر اس کی روح سراسر غیر فرقہ وارانہ تھی۔ یہ مظاہرہ ظالم کے خلاف مظلوم کا اعلانِ جنگ تھا اور زیر استبداد کا جابر و غاصب کے خلاف نعرۂ بغاوت تھا''۔ (ترجمہ)

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''Inside Kashmir'')

اس عظیم سانحہ نے کشمیر کی تحریکِ آزادی پر دوررس نتائج مرتب کیے۔ قربانی کا جو تسلسل اس روز سے شروع ہوا تھا، وہ تحریک کے مستقبل کے لئے نشانِ راہ یا روشن ستارہ ثابت ہوا۔

چوہدری غلام عباس اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

''ایسا دن اگر کیلنڈر میں موجود نہ ہوتا تو یقیناً ریاست کشمیر کی سیاسی تاریخ جو 1931ء سے لے کر آج تک مرتب ہو رہی ہے اور آئندہ بھی مرتب ہوتی رہے گی، بالکل مختلف ہوتی''۔

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 60)

ڈاکٹر سلام الدین نیاز کی رائے ہے:

''13 جولائی 1931ء کا دن کشمیر کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس دن تحریک حریت کی ابتداء خونِ شہداء سے ہوئی اور یہ پہلا قطرۂ ناحق تھا، جس نے تحریک حریت کی داستان کو رنگین بنایا اور شخصی حکومت و حکمرانی کو ہمیشہ معتوب و مغضوب کر کے دفن کر دیا''۔

(ڈاکٹر سلام الدین نیاز ''ان کہی داستانِ کشمیر'' صفحہ 172)

13 جولائی 1931ء کے خونچکاں سانحہ نے ڈوگرہ شاہی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور حکومت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اگر اس نے مسلمانوں کی شکایات مسائل کو اہمیت نہ دی اور انہیں نظر انداز کیا تو آئندہ بھی ایسے سانحات رونما ہو سکتے ہیں۔

25 جولائی کو مہاراجہ ہری سنگھ نے وزیر اعظم مسٹر ویکفیلڈ کو برطرف کر دیا۔ اس کی جگہ پنڈت ہری کشن کول کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ پی کے واتل کو بھی برطرف کر دیا گیا۔ مہاراجہ نے اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن ہائی

کوٹ کے چیف جسٹس سر برجورلال کی سربراہی میں قائم کیا۔ مسلمان راہنماؤں کو اس کمیشن کا ممبر بننے کی دعوت دی گئی، لیکن مسلمانوں نے اس کا بائیکاٹ کیا اور ممبر بننے سے انکار کر دیا، چنانچہ یہ کمیشن کام نہ کر سکا۔ بعدازاں مہاراجہ ہری سنگھ نے برطانوی حکومت ہند کے ایک آفیسر مسٹر بی جے گلانسی کی سربراہی میں دوسرا کمیشن مقرر کیا۔ اس کے تقرر پر مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی بھی تھی، چنانچہ اس کمیشن نے تحقیقات کے بعد جو سفارشات حکومت کو پیش کیں ان کے نتیجے میں مسلمانوں کو آئینی طور پر خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

O

5 گلانسی کمیشن

پسِ منظر
قیام
سفارشات
ردِعمل
اہمیت وافادیت

پسِ منظر:

13 جولائی 1931ء کے خونچکاں سانحے نے ریاست جموں کشمیر میں ہر طرف مسلمانوں کو مضطرب و پریشان کر دیا۔ اس واقعہ کے ردِعمل میں کئی دوسرے حادثات بھی پیش آئے۔ مسلم قیادت پسِ دیوارِ زنداں دھکیل دی گئی۔ ریاست بھر میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا جسے تشدد کے ذریعے وقتی طور پر حکومت دبانے میں کامیاب ہو گئی، لیکن مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کا ایسا لاوا تیار ہو گیا جسے ختم کرنا حکومت کے بس کا روگ نہ تھا۔ لندن اور ہندوستان کے اخبارات نے ان واقعات کی بھرپور کوریج کی اور ریاستی حکومت کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہی ایام میں 25 جولائی 1931ء کو پنجابی مسلمانوں نے علامہ اقبال اور مرزا بشیر الدین محمود جیسے زعماء کی قیادت میں کشمیری مسلمانوں کی مدد و حمایت کے لئے آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی جس نے ڈوگرہ حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ رہی سہی کسر احراریوں کی "کشمیر چلو موومنٹ" نے پوری کر دی۔ احراریوں کے سرخ پوش جتھے آندھی بن کر اُٹھے اور اُنہوں نے ڈوگرہ حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ برطانوی حکومتِ ہند جو ان حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ مہاراجہ پر دباؤ ڈالنے لگی۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ڈوگرہ حکومت کو احساس ہو گیا کہ حالات کو قابو میں لانے کیلئے مسلمانوں کے مطالبات و شکایات کو خاطر میں لانا پڑے گا اور طاقت و جبر کے بجائے آئینی و جمہوری راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ 5 اکتوبر 1931ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے جنم دن کے موقع پر سیاسی قیدیوں کیلئے عام معافی کا اعلان کیا۔ ہنگامی حالت ختم کر کے مخصوص مقامات پر تعینات فوج اور پولیس کو واپس بلا لیا گیا اور مہاراجہ نے اعلان کرتے ہوئے کہا "اگر میری رعایا کا کوئی طبقہ کوئی درخواست پیش کرنا چاہے تو اس پر غور کیا جائے گا"۔ مسلم قائدین نے مہاراجہ کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ 19 اکتوبر 1931ء کو خواجہ سعد الدین شال کی قیادت میں جموں اور سرینگر سے مسلم قائدین

کا ایک گیارہ رکنی وفد مہاراجہ سے ملا اور مسلمانوں کے مطالبات و مسائل پر مشتمل ایک مفصل یادداشت پیش کی جس میں ایک ذمہ دار نظامِ حکومت اور ریاست کیلئے آئین ساز اسمبلی کے قیام کا مطالبہ سرفہرست تھا۔

کمیشن کا قیام:

13 جولائی 1931ء اور اس کے بعد پیش آمدہ حالات و واقعات کا جائزہ لینے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو درپیش مسائل و مشکلات کی تحقیقات کے لئے 12 اکتوبر 1931ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ جسٹس یوسف صراف مہاراجہ ہری سنگھ کے اس اعلان کے موقع پر مسلمانوں کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب'' Kashmiri's Fight for Freedom '' میں لکھتے ہیں:

"On 13th November, at a largely attended public meeting held in Srinagar, Sheikh Mohammad Abdullah introduced a resolution welcoming its appointment and the commitment for introduction of constitutional reforms. Similar resolutions were passed in other Places".

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد اوّل صفحہ 439)

مہاراجہ ہری سنگھ نے برطانوی حکومتِ ہند سے درخواست کی کہ ایک قابل انگریز آفیسر کی خدمات مہیا کی جائیں جو ریاستی عوام کو درپیش مسائل و مشکلات کی تحقیقاتی رپورٹ تیار کرے۔ چنانچہ حکومت ہند نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک آفیسر مسٹر بی جے گلانسی کو تحقیقاتی کمیشن کیلئے ذمہ داریاں تفویض کیں۔ مسٹر برٹرینڈ گلانسی اس سے قبل ازیں ریاستی کابینہ میں ممبر مالیات رہ چکا تھا۔ اس نے بعد ازاں پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی۔ مسٹر گلانسی نے 31 اکتوبر 1931ء کو کمیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا چارج سنبھالا۔ ریاستی عوام کی نمائندگی کے لئے صوبہ کشمیر سے دو نمائندے خواجہ غلام احمد عشائی (مسلم) اور پنڈت پریم ناتھ بزاز (پنڈت) کو نامزد کیا گیا جبکہ صوبہ جموں سے دو نمائندے چوہدری غلام عباس (مسلم) اور لوک ناتھ شرما (ہندو) کو نامزد کیا گیا۔

شیخ محمد عبداللہ اپنی سوانح حیات ''آتشِ چنار'' میں اس کمیشن کی تشکیل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ''ذکر اقبال'' میں یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ اس کمیشن کے تقرر میں علامہ اقبال کا بھی دخل تھا۔ اس کے مطابق بھوپال کے نواب حمید اللہ خان، علامہ اقبال کے بڑے قدردان تھے اور نواب بھوپال کا مہاراجہ کشمیر پر بڑا اثر تھا۔ علامہ اقبال نے نواب بھوپال کے ذریعے مہاراجہ کو آمادہ کر لیا کہ مسلمانوں کی جائز اُمنگوں کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کریں اور اس طرح گلینسی کمیشن بنایا گیا''۔

(شیخ محمد عبداللہ ''آتش چنار'' صفحہ 133)

اس کمیشن کی تشکیل کے بارے چوہدری غلام عباس کی رائے ہے:

''یقین غالب ہے کہ اس کمیشن کے تقرر میں حکومت ہند کا بھی زبردست دخل تھا''۔

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 83)

کمیشن کے تقرر کا اعلان کرتے ہوئے حکومت نے اسے ایک آزاد تحقیقاتی کمیشن قرار دیا۔ اس کے کام اور دائرہ کار کو غیر محدود بتایا گیا۔ ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ دو تین ہفتوں کے اندر اندر اپنی شکایات و مطالبات کمیشن کے روبرو پیش کریں۔

ڈاکٹر سلام الدین نیاز لکھتے ہیں:

''حکومت نے کمیشن کے کام اور دائرہ کار کا تعین کر کے اعلان کر دیا تھا کہ اس کے دائرہ عمل سے کوئی بھی چیز باہر نہیں ہے۔ کمیشن ہر لحاظ سے آزاد تھا اور تمام سرکاری و غیر سرکاری معاملات کی تحقیق اور تصفیے کا ہر طرح مجاز تھا۔ وزراء کی کونسل سے لے کر ادنیٰ درجے کے افسروں تک سب کو احکامات جاری کر دیئے گئے تھے کہ کمیشن کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کریں اور ان کے ہر مطالبے اور محاسبے کی فوری تعمیل کریں۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ عام نوعیت کی شکایات جو مہاراجہ بہادر کے سامنے پیش کی گئی ہیں یا کمیشن کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ ان کی مناسب چھان بین ہو سکے۔

(ڈاکٹر سلام الدین نیاز ''ان کہی داستان کشمیر'' صفحہ 309)

نومبر کے آخری ہفتے میں مسٹر گلانسی کی سربراہی میں پانچ رکنی کمیشن نے سرینگر سے اپنے تحقیقاتی مشن کا آغاز کیا۔ اس کمیشن کے سامنے شیخ محمد عبداللہ سب سے پہلے گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ انہوں نے نہایت بیباکی اور جرأت کے ساتھ مفصل حقائق کمیشن کے سامنے رکھے۔ کمیشن کو اپنا کام شروع کیے ابھی دو ہی ہفتے گزرے تھے کہ صوبہ جموں کے ہندوؤں نے اپنا نمائندہ لوک ناتھ شرما کمیشن سے واپس بلا لیا۔ مسٹر شرما کمیشن سے قطع تعلق ہو کر جموں واپس چلے گئے۔ انہوں نے بظاہر کمیشن کا بائیکاٹ اس لئے کیا کہ کمیشن کے دائرہ کار میں ہندوؤں کے قانون وراثت کا معاملہ کیوں شامل کیا گیا۔ گویا یہ اُنکے مذہب میں مداخلت کے مترادف تھا۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز جو اس کمیشن کے ممبر تھے۔ ہندوؤں کی ناراضگی کی اصل وجہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"Reactionary and short-sighted Hindus disapproved and disliked the appointment of the Commission because they though t that it indicated that the Muslim movement was strong and irrestible. They brought heavy pressure to bear upon the Hindu members to resign in the hope that without their participation the Commission would not be able to function. Unhappily Lok Nath Sharma surrendered before these powerful forces of reaction but Prem Nath Bazaz would not yield ".

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''دی ہسٹری آف سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر'' صفحہ 161)

جموں کے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی وادیٔ کشمیر کے پنڈتوں نے بھی اپنے نمائندے پنڈت پریم ناتھ بزاز کو کمیشن سے علیحدگی اختیار کرنے پر بہت زور دیا۔ جب پنڈت جی کمیشن سے علیحدہ ہونے پر راضی نہ ہوئے تو پنڈت برادری نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ حتیٰ کہ انہیں پنڈتوں نے زدوکوب بھی کیا۔ پنڈت جی کا خیال تھا کہ اگر ریاستی باشندوں کو حقوق اور کچھ آزادیاں ملیں تو اس سے ریاست کے غیر مسلموں کو بھی اتنا ہی فائدہ ہو گا جتنا مسلمانوں کو۔

پنڈت موصوف خود اس بارے میں لکھتے ہیں:

"This created a well marked rift in the ranks of the Kashmiri Pandit political workers. All the reactionary and communal-minded Pandits have ever since arrayed on one side under *The Yuvak Sabha* (also called Kashmiri Pandits' Conference) to oppose the legitimate aspirations of the Muslims; on the other side has been the band of workers who agree with Prem Nath Bazaz that the progress and prosperity of Kashmiri Pandits is synonymous with the complete political, social and economic freedom of Kashmir and the liberation of the Muslim masses."

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''دی ہسٹری آف سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر'' صفحہ 62-161)

ہندوؤں اور پنڈتوں کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے سکھوں نے براہ راست اپنے مطالبات وزیراعظم ہری کشن کول کو پیش کیں۔ کمیشن نے دسمبر کے آخر تک سرینگر میں اپنا کام زور وشور سے جاری رکھا میں یہ جموں آ گیا۔ وہاں بھی سماعتیں جاری رہیں اور بہت سے وفود کمیشن کے روبرو پیش ہوئے۔

کمیشن نے رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں نہایت تندہی سے کام کیا اور مختصر عرصے میں یعنی 22 اپنی رپورٹ مکمل کر لی۔ اسی دوران مہاراجہ ہری سنگھ نے راجہ ہری کشن کول کو وزارتِ عظمٰی سے برطرف کر دیا جگہ برطانوی حکومتِ ہند کے ایک انگریز آفیسر کرنل اے جی ڈی کالون کو وزارتِ عظمٰی کی ذمہ داریاں سونپ اسے 27 فروری 1932ء کو وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ گلانسی کمیشن نے بیسیوں صفحات پر مشتمل جو سفارشات ان کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

کمیشن کی سفارشات

مذہبی آزادی

۱۔ ہر طبقے اور ہر برادری کو مکمل مذہبی آزادی دی جائے۔

۲۔ ایسی مساجد، مکابر اور عبادت گاہیں جہاں حکومت نے نقصِ امن کے پیش نظر پابندی ہے۔ وہاں سے پابندی اُٹھا کر ان مقامات کو ان کے جائز وارثین کے حوالے کیا جا

۳۔ ایک دوسرے کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنیوالوں کیخلاف سخت کارروائی کی

۴۔ اذان دینے پر کسی بھی جگہ پابندی عائد نہ کی جائے۔

۵۔ تمام عدالتیں توہینِ مذہب کے مجرموں کو عبرتناک سزائیں دیں۔

۶۔ تبدیلیٔ مذہب کے معاملے میں مذہبی اُصولوں کو ہی فوقیت دی جائے۔

سرکاری ملازمت

۱۔ ریاست کے تمام باشندوں کو سرکاری ملازمت کے مواقع بلا امتیاز مہیا کیے جائیں۔

۲۔ تمام آسامیوں کے لئے قواعد وضوابط مرتب کیے جائیں۔

۳۔ آسامیاں اشتہارات واخبارات کے ذریعے مشتہر کی جائیں۔

۴۔ اگر کسی ضلع میں موزوں اُمیدوار موجود ہو تو دوسرے ضلع سے وہ آسامی پُر نہ کی جائے۔

۵۔ چھوٹی آسامیاں پُر کرنے کا اختیار محکموں کے سربراہوں کو دیا جائے بشرطیکہ وہ انصاف کر سکیں۔

۶۔ سرکاری ملازمت کے لئے تعلیمی معیار زیادہ بلند نہ رکھا جائے۔

۷۔ ملازمت کے مواقع مہیا کرتے وقت مسلمانوں کے تناسب آبادی (78%) کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

کمیشن نے تمام محکمہ جات میں مسلم ملازمین کا موجودہ تناسب جاری کیا نیز ہر آسامی کے لئے تعلیمی معیار بھی تجویز کیا۔

تعلیمی ترقی

۱۔ تعلیمی مدارس کی تعداد اور مسلم مدرسین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔

۲۔ فنی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔

۳۔ سکولوں اور کالجوں میں سائنس پڑھنے کے خواہشمند طلباء کو ہر ممکن داخلہ دیا جائے۔

۴۔ ذیلدار اور نمبردار اپنے اپنے علاقے کے پرائمری مدارس کی کارگزاری میں دلچسپی لیں۔

۵۔ مسلمان طلباء کے لئے علیحدہ وظائف بھی مقرر کیے جائیں۔

۶۔ معاشرتی علوم کی تعلیم کا انتظام ہر سطح پر ہونا چاہیے۔

۷۔ مسلم طالبات کے لئے پردے کے معاملات پر خصوصی توجہ دی جائے۔

۸۔ ایک سپیشل مسلم ایجوکیشنل انسپکٹر کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

۹۔ لداخ اور گلگت میں تعلیمی ترقی کے لئے خصوصی انتظامات کیے جائیں نیز وہاں کی علاقائی زبانوں کو فروغ دیا جائے۔

۱۰۔ تعلیمی ترقی کے لئے مسٹر شارپ کی تعلیمی سفارشات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

مالیہ ومالکانہ

۱۔ مالیہ ومالکانہ میں معقول تخفیف کی جائے اور تمام علاقہ جات ریاست کو مساوی رکھا جائے۔

۲۔ تحصیل میر پور میں نوتوڑ کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔

۳۔ سرکاری مالکانہ معاف کر کے معمولی رقم بطور نذرانہ لی جائے۔

۴۔ فسادزدہ علاقوں میں جن لوگوں نے رضاکارانہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ ایسے لوگوں کا مالکانہ اور نذرانہ معاف کیے جائیں۔

۵۔ جو زمینیں ریاست کی ملکیت ہیں، لیکن قبضے کے حقوق کاشتکاروں کو حاصل ہیں۔ ان سب زمینوں کے مالکانہ حقوق بھی کاشتکاروں کو منتقل کر دیئے جائیں۔

زمین اور زراعت

۱۔ زرعی زمین جسے ریاست اپنے استعمال میں لانا چاہے، وہاں سے بیدخل کیے گئے کاشتکاروں یا زمینداروں کو معقول معاوضہ یا متبادل زمین فراہم کی جائے۔

۲۔ زرعی زمین کے تمام حقوق بحق سرکار تمام ریاست میں متروک قرار دیئے جاتے ہیں۔

۳۔ پنجاب میں رائج قانون انتقال اراضی کو ریاست میں نافذ کرنے کیلئے مشیر مال مناسب تجاویز پیش کریں۔

۴۔ راج تلک کے موقع پر زراعت پیشہ لوگوں کے لئے جن مراعات کا اعلان کیا گیا تھا ان پر پوری طرح عملدر آمد کیا جائے۔

۵۔ فصلوں کے تحفظ کی خاطر اسلحہ رکھنے کے لئے درخواست دینے والوں کی درخواستوں کو حتی الامکان منظور کیا جائے۔

درخت اور ٹیکس

۱۔ زمینداروں کو اپنی زمین سے درخت کاٹنے کی اجازت دی جائے۔

۲۔ جن زمینوں سے درخت کاٹ لئے جائیں وہاں سے ٹیکس نہ لیا جائے۔

۳۔ شہتوت کے درخت کاٹنے کی اجازت محکمہ ابریشم سے لی جائے۔

۴۔ چنار کے درخت کاٹنے کیلئے متعلقہ تحصیلدار کی اجازت ضروری ہے۔

۵۔ باغات کا ٹیکس حسب سابق برقرار رہے گا۔

جنگلات

۱۔ محکمہ جنگلات اپنی نگرانی میں دیہاتوں میں تعمیراتی لکڑی تقسیم کرے۔

۲۔ جنگلات کے ٹھیکے دیتے وقت ریاستی باشندوں کو ترجیح دی جائے۔

۳۔ ریاستی ٹھیکیداروں کی خاطر ٹھیکوں کی مالیت کم رکھی جائے۔

کرگل اور سکردو

۱۔ کرگل اور سکردو میں حکومت کاشتکاروں کو غلے کے جو بیج مہیا کرے، ان پر سود کم سے کم لیا جائے۔

۲۔ ان علاقوں میں دس کنال نتوڑ کی پابندی ختم کر دی جائے، تا ہم اس امر کا خیال رکھا جائے کہ

ایک کاشتکار کو زائد زمین دینے سے دوسروں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

کاہ چرائی

۱۔ مختلف اقوام کے چرواہوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔

۲۔ جموں، سانبہ، اکھنور، کٹھوعہ، جسمیر گڑھ، میر پور اور بھمبر کی تحصیلوں میں کاہ چرائی ٹیکس معاف کر دیا جائے۔

۳۔ قصاب جو بھیڑ، بکریاں میونسپلٹی کی حدود میں ذبح کرنیکی غرض سے لائیں، ان سے کاہ چرائی نہ لی جائے۔

متفرقات

☆ تمام حکومتی اہلکاران کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ''کار سرکار'' کے لئے بیگار نہ لیں۔ اس سلسلے میں جو کام لیا جائے، اس کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے۔

☆ رشوت ستانی کو روکنے کے لئے مہاراجہ نے جو احکامات جاری کر رکھے ہیں، ان کی سختی سے پابندی کی جائے۔ رشوت لینے یا دینے کے سلسلے میں جو ملازم ملوث پایا جائے، اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

☆ چنگی اور محصول کے نظام کو صاف وشفاف بنایا جائے۔

☆ ڈاکٹر مریضوں کی ضروریات کا خیال رکھیں اور ہر ڈسپنسری میں ایک تربیت یافتہ دائی بھرتی کی جائے۔

☆ صنعتی فروغ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

☆ ریاست میں میوہ جات اور ٹیکسٹائل کی صنعت خوب فروغ پا سکتی ہے۔ اس طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

☆ حکومت کارخانہ داروں کی حوصلہ افزائی کرے اور جو چیزیں ریاستی کارخانوں میں تیار ہوتی ہیں، وہ درآمد نہ کی جائیں۔

☆ کوآپریٹو قرضہ جات کو وسعت اور ترقی دی جائے۔

☆ ریاستی پریس ایکٹ کو تبدیل کر کے برطانوی ہند کے قانون کے مطابق بنایا جائے۔

☆ محکمہ پبلک ورکس کو مزید فعال بنایا جائے۔

☆ باشندہ ریاست سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار تحصیلداروں کو دیا جائے۔

☆ گوشت کی خرید وفروخت پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے۔

☆ مذہبی تقریبات کے موقع پر مسلمان اگر بھیڑ، بکری ذبح کریں تو ان سے کوئی فیس نہ لی جائے۔

☆ کنویں یا تالاب جو رفاع عامہ کے لئے بنائے گئے ہیں ان پر کسی مخصوص مذہب یا فرقے کی اجارہ داری قائم نہ ہونے دی جائے۔

☆ وزارتِ گلگت میں ٹھیکہ جات ٹینڈروں کی مناسب تشہیر اور ضابطے کی منظوری کے بعد ہی دیئے جائیں۔

☆ سرینگر سمیت بڑے شہروں میں میونسپلٹی کی ترقی کے لئے مناسب اقدامات کیے جائیں۔

☆ شہروں میں ذبیحہ پر پابندی صرف چار یوم کے لئے ہوگی۔

رام نومی، جنم اشٹمی، سالگرہ مہاراجہ بہادر، سالگرہ مہاراج کمار

مسٹر بی جے گلانسی برطانوی حکومت ہند کا نہایت قابل اور محنتی آفیسر تھا۔ اس نے چند ماہ کی محنت شاقہ کے بعد جو رپورٹ تیار کی۔ اس میں معمولی سے معمولی شکایت سے لیکر پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل شامل تھے۔ اس نے نہایت ذمہ داری اور غیر جانبداری سے یہ اہم مشن سرانجام دیا۔ چوہدری غلام عباس جو اس کمیشن کے ممبر تھے، وہ گلانسی کی محنت، صلاحیت کے بارے لکھتے ہیں۔

''گاؤکشی اور تبدیلی مذہب پر اولاد اور جائیداد کی ضبطی نہایت پیچیدہ معاملات تھے۔ ان دونوں کے خلاف اس نے رپورٹ لکھوائی، لیکن ایسی روانی، بے تکلفی اور معاملہ فہمی سے کہ جب مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں عش عش کر اٹھتا ہوں''۔

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 93)

رپورٹ جب تیار ہوگئی تو پنڈت پریم ناتھ بزاز، خواجہ غلام احمد عشائی اور چوہدری غلام عباس نے اپنے اپنے اختلافی نوٹ بھی لکھے۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز کے اختلافی نوٹ کا اہم نقطہ یہ تھا کہ سرینگر میں مسلمانوں کے لئے جو عیدگاہ تعمیر ہو رہی ہے۔ اس میں غیر مسلموں کو بھی چہل قدمی کی اجازت دی جائے۔

خواجہ غلام احمد عشائی اور چوہدری غلام عباس نے جو مشترکہ اختلافی نوٹ لکھا اس میں تین اہم مطالبات تھے۔ ان کے بارے جسٹس یوسف صرف لکھتے ہیں۔

The non-official members could not agree on certain points and, therefore, three notes of dissent formed part of the report. The first not e was jointly attached by Chaudhri Ghulam Abbas Khan and Khawaja Ghulam Ahmed Ashai, demanding:

1. Abolition of disabilities imposed on converts to Islamfrom Hinduism. Mr. Glancy had not been able to agree to the Muslim point of view and had in his report just confused the issue.
2. Restrictions on the licensing of arms in Kashmir valley and frontier districts should be removed.
3. The Rajput Training School, Jammu, should either be abolished or its admission thrown open to all sections of the population.

(جسٹس محمد یوسف صراف ''Kashmiri's Fight for Freedom'' جلد اوّل صفحہ 441)

چوہدری غلام عباس نے ایک علیحدہ اختلافی نوٹ بھی لکھا، جس کی وضاحت جسٹس یوسف صراف یوں کرتے ہیں۔

"Chaudhri Ghulam Abbas also appended a separate note on certain issues, the most important among them being the grant of propr ietary rights and assessment of land revenue. Chaudhri Sahib told this writer, while we were together in Montgomery jail, that a note had originally been written by Babu Mohammad Abdullah, the father of Mr. Qudratullah Shahab, who was, at one time, incharge of a Subdivision. Mr. Glancy considered the note too strongly-worded and f ailing to persuade Chaudhri Sahib to withdraw it, offered To draft a note on his behalf. Next morning, Mr. Glancy's note was approved by Chaudhri Sahib and the same was appended to the report. It recommended:

1. Muslim representation in services should be brought to their population ratio within ten years. In order to accelerate the process of achieving this target, Hindu employees who were already fifty years old or had put in twenty five years service, should be retired and the vacancies filled in by Muslim s.
2. Department promotions should not exceed one-third.
3. Recruitment to the cavalry should be thrown open to Muslims and in all new Regiments, Muslims should get at least one-half.
4. A Public Service Commission should be appointed and recruitment should be made through it.
5. Malikana dues should be remitted and proprietary rights granted to all tenants.
6. While in the Punjab, land revenue was assessed on the basis of one-sixth of produce, herein Jammu it was one-fourth; it should be brought at par with the Punjab ".

(جسٹس محمد یوسف صراف ''Kashmiri's Fight for Freedom'' جلد اوّل صفحہ 441-42)

چوہدری غلام عباس خود لکھتے ہیں۔

''دوسرے روز وہ اختلافی نوٹ لکھ کر لایا میرے لئے اس سے اختلاف کرنا بے حد مشکل تھا۔ الفاظ کی ہیرا پھیری اور نفس معاملہ کی موجودگی کی وجہ سے اس نوٹ پر نکتہ چینی بے حد مشکل تھی۔ میں نے ایک دو فقرے مختلف جگہوں پر ایزاد کر دیئے اور دیگر ممبروں نے بھی اس نوٹ کو خاطر خواہ ظاہر کیا۔ اس لئے میں نے اسے اپنا لیا''۔

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 97)

مسٹر گلانسی نے تینوں ممبران کے اختلافی نوٹ معمولی رد و بدل کے بعد رپورٹ میں شامل کر لئے۔ 22 مارچ 1932ء کو مسٹر گلانسی نے یہ رپورٹ مہاراجہ ہری سنگھ کو پیش کی اور مہاراجہ نے اس سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے 10 اپریل 1932ء کو اس رپورٹ پر دستخط فرما کر جملہ سفارشات پر عملدرآمد کے لئے متعلقہ حکام کو ہدایات جاری کیں۔

کشمیری پنڈتوں کا ردِ عمل

کشمیری ہندوؤں اور پنڈتوں نے پہلے تو کمیشن سے اپنے نمائندے واپس بلا کر کمیشن کو ناکام یا غیر مؤثر بنانے کی کوشش کی۔ لوک ناتھ شرما کی علیحدگی سے جموں کے ہندوؤں کی چال ایک حد تک کامیاب بھی رہی۔ وادی کے پنڈتوں نے بھی کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کیلئے پنڈت پریم ناتھ بزاز پر بہت دباؤ ڈالا، لیکن جب پنڈت صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو پنڈتوں نے 141 صفحات پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کیے۔

کمیشن کی رپورٹ منظرِ عام پر آتے ہی پنڈتوں نے کمیشن پر جانبداری اور مسلم نوازی کا الزام عائد کیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز پر حملے کیے گئے، انہوں نے جان بچانے کے لئے اپنی رہائش پنڈتوں کے محلے سے مسلمانوں کے محلہ آبی گزر میں خواجہ محمد سلطان کے مکان میں منتقل کر لی۔

پنڈتوں نے مہاراجہ ہری سنگھ پر مسلم نوازی اور ہندو دشمنی کا الزام لگایا اور کمیشن کی سفارشات کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک میں پنڈت کشپ بندھو اور جیالعل کلم پیش پیش تھے۔ اس ایجی ٹیشن کو ''روٹی موومنٹ'' کا نام دیا گیا۔ ایک اشتہار شائع کیا گیا جس کا عنوان تھا ''نوجوانو بیدار ہو جاؤ، اُٹھو اور روٹی کا مطالبہ کرو'' پنڈتوں نے حکومت کے خلاف جلسے جلوس اور مظاہرے کیے، جس سے امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ حکومت نے بہت سے پنڈتوں کو گرفتار کر کے تحریک پر قابو پا لیا۔ پنڈت لیڈروں نے تحریری طور پر حکومت کو یقین دلایا کہ وہ ایجی ٹیشن ختم کرتے ہیں اور آئندہ اپنی شکایات آئینی طریقے سے پیش کریں گے۔

اہمیت و افادیت

ریاست جموں کشمیر میں سیاسی و آئینی جدوجہد کے حوالے سے گلانسی کمیشن کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں۔

"It is a document of great historical importance, as it established beyond doubt that real grievances existed which needed redress. The main recommendations of the Commission were readily accepted by His Highness."

(پنڈت پریم ناتھ بزاز '*The History of Struggle for Freedom in Kashmir*' صفحہ 162)

چوہدری غلام عباس کمیشن کی اہمیت یوں بیان کرتے ہیں۔

''گلانسی کمیشن کی رپورٹ نے مسلمانانِ ریاست کی زبوں حالی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور ملازمتوں میں پسماندگی کا صحیح مرقع دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور بعض معاملات میں مجرمانہ تساہل پر حکومت کو موردِ الزام گردانا۔ برادرانِ وطن کو یہ رپورٹ بھلی معلوم نہ ہوئی، کیونکہ اس کی وجہ سے اُن کی قدیم اجارہ داری ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس مسلمانانِ ریاست بالخصوص تعلیمیافتہ طبقہ اس رپورٹ کو اسلامیانِ ریاست کے حقوق کا منشور کہہ کر پکارتا رہا''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 97، 98)

پروفیسر محمد سرور عباسی کمیشن کی افادیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''گلانسی کمیشن کی سفارشات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی کہ مسلمانوں کی تحریک کوئی بغاوت یا سازش نہ تھی بلکہ اُنہیں جائز حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ وہ ہندوؤں اور نہ مہاراجہ کے خلاف تھے بلکہ اُن کی ساری کوششوں اور قربانیوں کا منشا یہ تھا کہ نظامِ حکومت میں ایسی تبدیلی لائی جائے کہ انہیں ان کے جائز حقوق حاصل ہو جائیں''۔ (پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کا جدوجہد آزادی'' صفحہ 180)

گلانسی کمیشن کی رپورٹ میں مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں درپیش مسائل و مشکلات کو زیرِ غور لایا گیا تھا اور ان کے ازالے کے لئے حکومت کو مفید تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اس سے ایک طرف تو بیرونِ ریاست ہونے والے اس پروپیگنڈے کا قلع قمع ہوا، جس میں کہا جا رہا تھا کہ ریاست کشمیر کے مسلمانوں کو کوئی مسائل و مشکلات درپیش نہیں ہیں۔ محض ہندی مسلمان یا ہندوستانی پریس پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ کمیشن نے جب مسلمانوں کو درپیش مسائل و مشکلات کا جائزہ لیا اور رپورٹ پیش کی تو ہندو نواز حلقوں نے چپ سادھ لی۔

کمیشن کی رپورٹ میں بہت سے ایسے معاملات و مسائل بھی زیرِ بحث آئے جن سے ریاست کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو بھی خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ یہ کمیشن اگر تحقیقات نہ کرتا تو یہ طبقے بھی محروم رہتے۔ گلانسی کمیشن کی کارروائی سے ریاست جموں کشمیر میں مصروفِ جدوجہد سیاسی، سماجی اور مذہبی حلقوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ سیاسی، آئینی اور جمہوری راستہ ہی بہتر اور کامیاب راستہ ہے۔

گلانسی کمیشن کی رپورٹ منظرِ عام پر آتے ہی مہاراجہ ہری سنگھ کے حکم سے مسٹر گلانسی کی صدارت میں ہی ریاست کے تمام مذاہب کے نمائندوں کی ایک آئینی کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں آئینی اصلاحات کے علاوہ ریاست میں ایک قانون ساز اسمبلی کا ڈھانچہ مرتب کرنے کے لئے ضروری امور کا جائزہ لیا گیا۔ یہ کانفرنس چودہ اراکین پر مشتمل تھی، مذکورہ کمیشن کے ممبران بھی اس میں شامل تھے۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے 28 مئی 1932ء کو آئینی کانفرنس کی رپورٹ کی منظوری دی اور سر برجور دلال کی سربراہی میں فرنچائز کمیٹی تشکیل دی، جس نے ریاست کیلئے آئین ساز اسمبلی کا ڈھانچہ تیار کیا۔ یہ سب کچھ گلانسی کمیشن کی بدولت ہی ممکن ہوا۔

O

6

آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس

پسِ منظر
قیام
اغراض و مقاصد

پس منظر:

بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ مسلمانانِ ریاست جموں کشمیر کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور انہیں بیداری کا پیغام دیا۔ اس عہد میں اگرچہ مسلمان دینی وملی جذبے سے سرشار تھے اور اس جذبے کی تسکین کیلئے انہوں نے چھوٹی چھوٹی مذہبی و معاشرتی انجمنیں بھی قائم کر رکھی تھیں، لیکن جدید تعلیم نہ ہونے اور سیاسی شعور کے شدید فقدان کی وجہ سے ان کی حالت مجبور اور بے بس رعایا کی سی ہوگئی تھی۔ اس صورتحال میں چند تعلیمیافتہ نوجوان سامنے آئے اور انہوں نے جموں میں ینگ مینز مسلم ایسوی ایشن اور سری نگر میں ریڈنگ روم کا قیام عمل میں لایا۔ اگرچہ ابتداً ان تنظیموں کا دائرہ کار محض رفاعی وفلاحی سرگرمیوں تک محدود تھا، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے ملکی وقومی مسائل پر بھی سوچ وبچار شروع کی۔

1931ء کا سال شروع ہوتے ہی مسلمانانِ کشمیر ایک نئے دور میں داخل ہوئے اور اس سال 13 جولائی کو جو عظیم سانحہ رونما ہوا اس کے لہو کی سرخی نے ایک طرف ڈوگرہ حکومت کی بنیادیں ہلا دیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو حریت اور سرفروشی کی نئی زندگی سے آشنا کیا۔ اس نئی زندگی میں مار پیٹ، پکڑ دھکڑ، قید وبند اور ابتلاء وآزمائش کی ایسی ہوا چلی جس نے مسلمانوں کو سوچ وفکر کی جیتی جاگتی راہوں پر لا کھڑا کیا۔ ان ہنگامہ آرائیوں اور خونریزیوں نے مسلمانوں کو اتحاد ویگانگت کا پیغام دیا اور انہیں اپنے حقوق کی بحالی اور حکمرانوں کے جبر وتشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے نئی صف بندی کی طرف متوجہ کیا۔ گلانسی کمیشن کا تقرر اور پھر 1932ء کو اس کی سفارشات منظرِ عام پر آنے کے بعد فضا کے جذباتیت اور جوش وجنون کم ہوا تو ینگ مینز مسلم ایسوی ایشن اور ریڈنگ روم سے وابستہ نوجوان نئے خطوط پر سوچنے لگے۔

27 مئی 1932ء کو کشمیر کمیٹی کے راہنما مرزا بشیرالدین محمود نے کشمیر کے چیدہ چیدہ زعماء کو ایک خط ارسال کیا جس میں انکی توجہ ریاستی مسلمانوں کی ترجمانی کے لئے ایک سیاسی جماعت کے قیام کی طرف مبذول کروائی گئی تھی۔ 4 جون 1932ء

کو شیخ محمد عبداللہ اوران کے ساتھی جیلوں سے رہا ہوئے تو انہوں نے سیاسی جماعت کے قیام کیلئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔

جسٹس محمد یوسف صراف لکھتے ہیں:

"After the release of Political Leaders on 4th June, 1932, the move gained momentum. According to Maulana Muhammad Saeed Masoodi the decision to form a party and name it Muslim Conferencewas taken in the Central Jail Srinagar in cause of discussions he had with Sheikh Muhammad Abdullah, while both were interned together".

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 482)

اسی سلسلے میں شیخ عبداللہ جموں آئے۔ یہاں وہ مستری یعقوب علی، چوہدری غلام عباس، شیخ غلام قادر، [illegible] اور سردار گوہر رحمٰن وغیرہ سے ملے۔ ان سب نے سیاسی جماعت کے قیام کی سوچ سے اتفاق کیا۔ البتہ سردار گوہر رحمٰن خان جموں میں الگ سیاسی جماعت بنانے کے حق میں تھے۔ جولائی 1932ء کو شیخ عبداللہ لاہور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے علامہ اقبال، سید محسن شاہ، میاں امیرالدین اور مرزا بشیرالدین محمود سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان راہنماؤں نے نہ صرف سیاسی جماعت کے قیام سے اتفاق کیا، بلکہ شیخ صاحب کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ ان راہنماؤں نے اس ضمن میں ایک پولیٹیکل کانفرنس کے انعقاد کی تجویز دی۔ چنانچہ شیخ صاحب نے لاہور سے واپسی پر جموں اور [illegible] کے دوستوں سے مشورہ کیا اور آل جموں کشمیر پولیٹیکل کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وادیٔ کشمیر میں مولوی عبداللہ وکیل، مولوی عبدالرحیم، مفتی جلال الدین، بخشی غلام محمد، غلام نبی گلکار، محمد یوسف علیگ، غلام قادر، محمد رفیق، غلام محی الدین میر، میر مقبول اور مولوی سعید مسعودی متحرک ہو گئے۔ شیخ عبداللہ اوران کے رفقاء نے سری نگر اور جموں کے علاوہ ریاست کے دیگر علاقوں میں بھی اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے ہم خیال لوگوں سے رابطے کئے۔ شوپیاں میں خواجہ عبدالعزیز کوٹے، عبدالرحمٰن ڈار، اننت ناگ میں مرزا افضل بیگ، مظفرآباد میں پیر حسام الدین [illegible] میاں احمد یار، گلگت میں خواجہ عبدالغنی، پونچھ میں منشی دانشمند وکیل، خواجہ غلام احمد بٹ اور میرپور میں راجہ اکبر [illegible] وغیرہ نے دن رات محنت کی۔

چنانچہ 16 ستمبر 1932ء کو پتھر مسجد سری نگر میں "آل جموں کشمیر پولیٹیکل کانفرنس" کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت مولانا علم الدین سالک نے کی۔ ریاستی قائدین اور کارکنوں کے علاوہ پنجاب سے مولانا سید حبیب (مدیر "سیاست")، پروفیسر علم الدین سالک، سید ولی اللہ شاہ زین العابدین، عبدالرحیم درد، مولانا اسمٰعیل غزنوی، [illegible] ظہور احمد اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے وکلاء کے ایک وفد نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مسلمانانِ جموں کشمیر کیلئے نئی سیاسی جماعت کا باقاعدہ قیام عمل میں لانے کیلئے 23 ستمبر کو اسی مقام پر ایک اور کانفرنس [illegible] کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مجوزہ کانفرنس کے انعقاد سے ایک روز پہلے سری نگر میں کشمیری پنڈتوں نے گلانسی کمیشن کی سفارشات کو بہانہ بنا کر زبردست شورش برپا کر دی، جس کے سبب 23 ستمبر کو ہونیوالی کانفرنس ملتوی کر دی گئی اور کانفرنس کیلئے 19 [illegible] کو نئی تاریخ متعین ہوئی۔

قیام:

14 اکتوبر 1932ء کو سری نگر کے تاریخی مقام ''پتھر مسجد'' کے احاطے میں تین روزہ اجتماع شروع ... دیکھتے ہی دیکھتے ملکہ نور جہاں کی تعمیر کردہ اس شاہی مسجد میں دل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ ریاست بھر سے آئے ... تقریباً تین لاکھ فرزندانِ اسلام کے اس فقید المثال اجتماع نے شاہی مسجد کو ایک زیارت گاہ میں تبدیل کر دیا ... محسوس ہونے لگا تھا کہ صدیوں سے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے کشمیری مرد و زن اور بچے، بوڑھے بیدار ہو ... اور کسی نئے دور کی بنیاد رکھنے آئے ہیں۔

پتھر مسجد کے وسیع و عریض صحن اور اس سے ملحقہ احاطے کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس ... نمائشی محرابوں، جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ مسجد کے صحن میں زمین سے پندرہ فٹ اونچا سٹیج ... جس پر ریاست بھر سے تشریف لائے ہوئے دو سو خصوصی مندوبین اور ہندوستان سے تشریف لانیوالے مہمانوں ... اور پریس نمائندگان کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ لاؤڈ سپیکر کا انتظام نہایت معقول اور تسلی بخش تھا۔ حاضرین کے قیام ... کا وسیع انتظام تھا۔ دریائے جہلم میں سیکڑوں ہاؤس بوٹ مختص کر کے خصوصی شہر بنایا گیا تھا۔

جلسہ گاہ کے آس پاس رضا کاروں کے خیمے نصب تھے۔ یہ سب انتظامات اتنی عمدگی اور سلیقے سے کیے گئے تھے کہ دیکھنے والے ششدر رہ گئے۔ حکومتی مشینری کی آنکھیں تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جلسے کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اس کے بعد کشمیر کمیٹی کے ایک راہنما ولی اللہ زین العابدین نے پرچم کشائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ نئی معرضِ وجود میں آنے والی جماعت کیلئے سبز پرچم کا انتخاب کیا گیا جس پر چاند تارا بنا ہوا تھا۔ یہ پرچم آئینی کمیٹی نے تجویز کیا تھا۔ تحریک حریت کے اُبھرتے ہوئے نوجوان راہنما شیخ محمد عبداللہ کو کرسی صدارت پہ بٹھایا گیا۔ خواجہ غلام احمد عشائی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جس میں مندوبین کو اس اجتماع میں تشریف لانے پر خوش آمدید کہا گیا اور اس جلسے کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط بیان کیے گئے۔ اجتماع میں ہندوستان کے ان مسلم زعماء کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے جو یہاں تشریف نہیں لا سکے تھے۔ علامہ محمد اقبال، خواجہ حسن نظامی اور مرزا بشیر الدین محمود وغیرہ شامل تھے۔ ان زعماء نے مسلمانانِ ریاست جموں کشمیر کی سیاسی جماعت کی تشکیل پر مبارکباد کے پیغامات بھیجے تھے اور نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

خطبۂ صدارت:

صدر جلسہ شیخ محمد عبداللہ نے مفصل صدارتی خطبہ پیش کیا، جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

''ہم آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے زعماء کرام اور ان سیاسی صحافتی حلقوں کے شکرگزار ہیں جنہوں نے ہماری جدوجہد میں بھرپور معاونت کی۔ ہماری جدوجہد فرقہ وارانہ نہیں ہے اور نہ ہی ہم کشمیر میں بسنے والے غیر مسلموں کے خلاف ہیں۔ ہماری جدوجہد ریاست میں بسنے والے تمام مظلوم و مجبور انسانوں کیلئے ہے۔ ہم مہاراجہ کے باقی نہیں ... ہم اس کی ذات کے خلاف ہیں۔ ہم صرف اپنے حقوق مانگتے ہیں اور حقوق مانگنا کوئی بغاوت نہیں''۔

''ہماری طرف سے بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ تحریکِ کشمیر کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔ بلکہ سب ... کی شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے ہے اور میں اپنے برادرانِ وطن کو خواہ ہندو ہوں یا سکھ، یقین دلاتا ہوں کہ ہم ... کے دکھوں کو دور کرانے کے لیے اسی طرح تیار ہیں جس طرح مسلمانوں کے دکھوں کو۔ ہمارا ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک ہم ایک دوسرے سے صلح کے ساتھ رہنا نہ سیکھیں اور وہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ایک دوسرے کے جائز حقوق کا احترام کریں اور ایک دوسرے کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کریں۔ پس تحریکِ کشمیر ہرگز کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔''

(شیخ محمد عبداللہ ''آتشِ چنار، ص 115 ایڈیشن 2008، سری نگر)

آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس......... اغراض و مقاصد:

اس اجلاس میں مسلمانانِ جموں کشمیر کیلئے ایک نمائندہ سیاسی جماعت تشکیل دینے کی قرارداد پیش کی گئی، جسے تمام مندوبین نے اتفاقِ رائے سے منظور کیا۔ جماعت کا نام ''آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس'' رکھا گیا۔ جس کا دستورِ اساسی بھی پیش ہوا اور مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد متعین کیے گئے۔ طے پایا کہ جماعت کا صدر مقام سری نگر ہوگا۔

الف۔ مسلمانانِ جموں کشمیر کی تنظیم۔

ب۔ اتحاد بین المسلمین قائم رکھنا اور مضبوط کرنا۔

ج۔ مسلمانانِ جموں کشمیر کے سیاسی حقوق کی حفاظت۔

د۔ مسلمانانِ جموں کشمیر کی اخلاقی، تعلیمی، معاشرتی، تمدنی و اقتصادی اصلاح و ترقی کیلئے جدوجہد کرنا۔

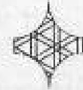
... کانفرنس کا مکمل دستورِ اساسی ملاحظہ فرمائیں مرزا شفیق حسین کی تالیف ''کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد'' دستاویز نمبر سات (ص 487)

مختلف امور پر غور و فکر کرنے، سفارشات مرتب کرنے اور قراردادیں تیار کرنے کیلئے تین سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے دو تین روز کی محنت شاقہ کے بعد مفصل سفارشات اور قراردادیں پیش کیں۔ جن میں ریاست جموں کشمیر میں مسلمانوں کو درپیش تمام مسائل و مشکلات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ جماعت کا مرکزی دفتر سری نگر میں قائم کیا گیا اور ریاست بھر میں ہر سطح پر اس کے دفاتر قائم کرنے اور تنظیم سازی کا عندیہ ظاہر کیا گیا۔ کام کی زیادتی اور ضروریات کے پیش نظر اس اولین اجلاس کا دورانیہ مزید دو دن کے لئے بڑھا دیا گیا۔ یوں 18 اکتوبر 1932ء کو یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

مرکزی عہدیداران:

اتفاقِ رائے سے ایک سال کیلئے حسب ذیل مرکزی عہدیداران کا انتخاب عمل میں لایا گیا:

صدر	شیخ محمد عبداللہ
نائب صدر	شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ
جنرل سیکرٹری	چوہدری غلام عباس
جوائنٹ سیکرٹریز	مولوی عبدالرحیم وکیل،
	میاں احمد یار خان،
	عبدالحکیم،
	غلام احمد



7

ریاست جموں کشمیر میں قانون ساز اسمبلی "پرجا سبھا" کا قیام اور تین انتخابی معرکے

13 جولائی 1931ء کو سنٹرل جیل سرینگر کے باہر مقامی پولیس کی فائرنگ سے 22 مسلمانوں کی شہادت کے المناک سانحہ اور اس کے بعد پیش آمدہ حالات و واقعات کی تحقیقات کے لئے مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک انگریز آفیسر مسٹر بی جے گلانسی کی سربراہی میں اکتوبر 1931ء کو جو تحقیقاتی کمیشن قائم کیا اس نے جب 22 مارچ 1932ء کو اپنی مفصل رپورٹ حکومت کو پیش کی تو اس میں ریاست جموں کشمیر کے لئے ایک قانون ساز اسمبلی کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے مسٹر گلانسی کی سربراہی میں ہی 8 مارچ 1932ء کو یک آئینی کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جس میں 2 سرکاری اور 12 غیر سرکاری ارکان شامل تھے۔ اس کانفرنس میں ریاست کے جملہ مذاہب اور علاقہ جات کی نمائندگی موجود تھی۔ کانفرنس نے کافی غور و خوض کے بعد ریاست میں قانون ساز اسمبلی قائم کرنے اور اس کے دائرہ کار، ہیت ترکیبی اور طریقہ انتخاب وغیرہ کے بارے سفارشات پیش کیں۔ مسٹر گلانسی نے آئینی کانفرنس کی سفارشات کو حتمی شکل دینے کے لئے ایک "فرنچائز کمیٹی" تشکیل دینے کی تجویز بھی پیش کی، مہاراجہ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور 31 مئی 1932ء کو حسب ذیل ممبران پر مشتمل فرنچائز کمیٹی تشکیل دی۔

۱۔	سر برجور دلال	چیف جسٹس	چیئرمین
۲۔	مسٹر ایل ڈبلیو جارڈین	آئی سی ایس	وائس چیئرمین
۳۔	خان بہادر شیخ عبدالقیوم		رکن
۴۔	سردار ٹھاکر کرتار سنگھ		رکن
۵۔	رام ناتھ شرما	رجسٹرار ہائی کورٹ	سیکرٹری

24 مارچ 1933ء کو کمیٹی کی تشکیل نو کرتے ہوئے نمبر شمار 2 اور 5 کی جگہ بالترتیب سر آئی ایلیٹ اور میر اللہ دینہ کو کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔

کمیٹی کو ضروری معلومات حاصل کرنے اور حتمی سفارشات مرتب کرنے کے لئے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اس کی تشکیل پر احتجاج کیا، لیکن حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

فرنچائز کمیٹی کی سفارشات:

20 جنوری 1934ء کو فرنچائز کمیٹی نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں۔

معیادِ اسمبلی: اسمبلی کی معیاد تین سال مقرر کی گئی۔

سیٹیں: کمیٹی نے 75 ارکان پر مشتمل اسمبلی کی تجویز پیش کی۔ جن میں ووٹوں کے ذریعے منتخب کئے گئے۔ ممبران 33، نامزد ممبران 14 سٹیٹ کونسلرز 16، اور سرکاری ممبر 12 تھے۔ مختلف مذاہب کے لئے سیٹوں کی تخصیص حسب ذیل تھی۔

مذہب	منتخب ممبران	نامزد ممبران	سٹیٹ کونسلرز	سرکاری ممبرز	کل
مسلم	21	06	05	02	34
ہندو	10	05	10	10	35
سکھ	02	01	01	×	4
بدھ	×	02	×	×	2
	33	14	16	12	75 کل ممبران اسمبلی

اہلیت ممبران: ریاست جموں کشمیر کا کوئی بھی باشندہ جو حسب ذیل شرائط پوری کرتا ہو (اپنے حلقہ انتخاب سے) ممبر اسمبلی منتخب ہو سکتا ہے۔

۱۔ جس کی عمر 25 برس سے زائد ہو۔

۲۔ جو اُردو زبان لکھنے، پڑھنے پر عبور رکھتا ہو۔

کسی فوجداری عدالت سے عرصہ 6 ماہ سے زائد مدت تک سزا پانے والے، اختتام سزا سے 5 سال تک اسمبلی کے ممبر منتخب نہیں ہو سکیں گے۔

اہلیت ووٹرز:

ووٹرز کی عمر کم از کم 21 برس ہو اور وہ حسب ذیل اہلیت رکھتا ہو۔

۱۔ ذیلدار، نمبردار اور سفید پوش۔

۲۔ مساجد کے امام یا مفتی، مندروں کے پروہت، گردواروں کے گرنتھی، چرچوں کے پادری جو قبل ازیں 6 ماہ سے یہ خدمات سرانجام دے رہے ہوں۔

۳۔ خطاب یافتہ

۴۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر پنشن پانے والے جن کی کم از کم پنشن 10 روپے ہو۔

۵۔ ڈاکٹرز، حکیم، وید، وکلاء اور اساتذہ۔

۶۔ مرد اور عورتیں جنہوں نے کم از کم مڈل تک تعلیم حاصل کی ہو یا اس کے مساوی اُردو، فارسی، ہندی یا سنسکرت کی تعلیم پائی ہو۔

۷۔ کم از کم 20 روپے سالانہ لگان دینے والے اشخاص۔

۸۔ کم از کم 20 روپے سالانہ ادا کرنے والے علاقہ دار، جاگیردار اور معافی دار۔

۹۔ کم از کم 20 روپے سالانہ ادا کرنے والے کرایہ دار۔

۱۰۔ کم از کم 600 روپے کی غیر منقولہ جائیداد رکھنے والے لوگ۔

۱۱۔ کم از کم 20 روپے سالانہ کاہ چرائی ادا کرنے والے لوگ ماسوائے بکروال کے۔

(جسٹس محمد یوسف صراف ''Kashmiri's Fight for Freedom'' جلد اوّل صفحہ 503)

فرنچائز کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں، اُسے مسلم کانفرنس کے راہنماؤں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اس پر بہت سے اعتراضات اُٹھائے۔ چوہدری غلام عباس نے کمیٹی کی سفارشات کو ناقابلِ قبول اور مجوزہ اسمبلی کو نمائشی اسمبلی قرار دیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی ان سفارشات کو نہایت مایوس کُن اور جمہوری روح کے منافی قرار دیتے ہوئے تحریری طور پر ایک مفصل تبصرہ جاری کیا۔ مسلمانوں کو اس کمیٹی کی سفارشات کے تین پہلوؤں پر شدید اعتراض تھا۔

۱۔ مسلمانوں کو اُن کی آبادی کے تناسب (78%) سے نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔ آبادی کا تناسب اگر ملحوظِ نظر رکھا جاتا تو 75 ممبران کی اسمبلی میں کم از کم 60 نشستیں مسلمانوں کے لئے مختص ہوتیں۔ کمیٹی نے مسلمانوں کے لئے 45 فیصد نشستیں تجویز کیں۔ اس کے برعکس غیر مسلم جو آبادی کا 23 فیصد تھے، انہیں 55 فیصد نشستیں دی گئیں۔

۲۔ چھ ماہ سے زائد سزائے قید کاٹنے والوں کے لئے آئندہ 5 سال تک اسمبلی ممبر بننے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس میں سیاسی قیدیوں اور اخلاقی مجرموں میں کوئی تخصیص نہ رکھی گئی۔

۳۔ 75 ممبران کی اسمبلی میں حکومت کے نامزد کردہ ممبران کے لئے 42 نشستیں رکھی گئیں، جبکہ ووٹوں کے ذریعے منتخب ہونے والے ممبران کے لئے 33 نشستیں رکھی گئیں۔

مسلم کانفرنس کے راہنماؤں نے فرنچائز کمیٹی کی سفارشات کے دیگر کئی پہلوؤں پر بھی اعتراض کیا اور اس کمیٹی کی سفارشات میں ضروری ترامیم کے لئے تحریری یا زبانی طور پر کمیٹی کے ممبران اور ریاستی حکومت کو اپنی تجاویز ارسال کیں، لیکن جب حکومت نے ان تجاویز کو خاطر میں نہ لایا تو مسلم کانفرنس نے حکومت کے اس رویے کے خلاف تحریک کا اعلان کر دیا اور جماعت کے سیکرٹری جنرل چوہدری غلام عباس کو اس تحریک کا ڈکٹیٹر مقرر کیا۔ 2 مارچ 1934ء کو چوہدری غلام عباس کے حکم پر صوبہ جموں کے جوشیلے کارکنوں نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ چنانچہ چوہدری غلام

عباس سمیت مسلم کانفرنس کے دیگر کئی راہنما صوبہ جموں سے گرفتار کر لئے گئے۔

ریاست بھر میں گرفتاریوں اور تشدد کی لہر پھیل گئی۔ شیخ محمد عبداللہ چونکہ سول نافرمانی کی تحریک سے کوئی
نہیں تھے اور نہ ہی وہ مجوزہ اسمبلی سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اس تحریک سے اپنے آپ کو
رکھا۔ اس کے برعکس چوہدری غلام عباس مجوزہ اسمبلی اور انتخابی عمل میں مسلم کانفرنس کی شمولیت کے حق میں نہیں تھے

ریاستی اسمبلی (پرجاسبھا) کے پہلے انتخابات اور مسلم کانفرنس کی تاریخی کامیابی

فرنچائز کمیٹی کی سفارشات کے خلاف مسلمانوں کے ردعمل کا یہ فائدہ ہوا کہ مسلمانوں کے لئے
سرکاری ممبر اور 2 سٹیٹ کونسلرز کا مزید اضافہ کیا گیا۔ اس طرح 75 ممبران کے ایوان میں مسلمانوں کی کل نشستیں
گئیں۔ اس طرح مہاراجہ نے 6 وزراء کی کابینہ میں 2 مسلمان وزراء لینے کا عندیہ بھی ظاہر کیا۔ چنانچہ 19
1934ء کو سرکاری حکم جاری کیا گیا، جس کے تحت پرجاسبھا کا قیام اور اس کے دائرہ اختیار کا اعلان ہوا۔ الیکشن کی
4 ستمبر 1934ء مقرر کی گئی۔

مسلم کانفرنس نے قانون ساز اسمبلی کے قیام اور انتخابات کا خیر مقدم کیا۔ بلاشبہ اس اسمبلی کے قیام
انتخابی عمل کے اجراء کے لئے ریاست جموں کشمیر کے مسلمانوں کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کارفرما تھی۔ مسلم کانفرنس
قائم ہوئے اگرچہ دو برس سے بھی کم عرصہ ہوا تھا اس طرح مسلم کانفرنس نے بھی ریاست میں ایک ذمہ دار اور
نظام حکومت کے قیام کے لئے گرانقدر قربانیاں دی تھیں۔ مسلم کانفرنس کے قائدین قید و بند اور جبر و تشدد کی
آزمائشوں سے گزرے۔ کئی قائدین اس وقت بھی جیلوں میں بند تھے۔

مسلم کانفرنس کی سنجیدہ قیادت اب جبر و تشدد اور جلاؤ گھیراؤ کا راستہ چھوڑ کر اپنی جدوجہد کو جمہوری اور
خطوط پر استوار کرنے کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نادر موقع کو ضائع کرنے کے بجائے مسلم کانفرنس نے
بحیثیت جماعت شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں انتخابی معرکے میں بھرپور حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ شیخ عبداللہ نے اعلان کیا۔

"اسمبلی کا موجودہ ڈھانچہ اگرچہ ہماری توقعات سے بہت کم ہے، تاہم ہمیں تدبر سے کام لینا چاہیے اور
انتخابات میں حصہ لے کر حکومت اور دنیا پر واضح کر دینا چاہیے کہ مسلم کانفرنس کی طاقت کتنی ہے"۔

چوہدری غلام عباس ان دنوں اودھمپور جیل میں قید تھے۔ شیخ عبداللہ نے صدر جماعت کی حیثیت سے
نافرمانی کے خاتمے کا اعلان کیا اور ریاست بھر میں مسلم کانفرنس کے کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ انتخابات کی تیاری شروع
کر دیں اور ہر حلقے سے اُمیدوار سامنے لائیں۔ شیخ صاحب جیل میں چوہدری غلام عباس کو بھی ملے اور انہیں صورت
حال کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے اُنہیں حکمت عملی سے کام لینے کا مشورہ دیا، لیکن چوہدری غلام عباس اپنے
پر ڈٹے رہے اور مسلم کانفرنس کے الیکشن میں حصہ لینے کی مخالفت سے دستبردار نہ ہوئے۔

انتخابی معرکہ

ریاست جموں کشمیر کی تاریخ میں قانون ساز اسمبلی جسے "پرجا سبھا" کا نام دیا گیا تھا، کا پہلا انتخابی معرکہ 3
ستمبر 1934ء کو پیش آیا۔ اگلے روز 4 ستمبر کو انتخابی نتائج کا اعلان کیا گیا۔ مسلم کانفرنس کو انتخابات میں سو فیصد کامیابی
حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی 21 نشستوں میں سے 19 نشستوں پر ممبران کامیاب ہوئے۔ مسلم کانفرنس کے قائدین نے
انتخابات کی کامیابی کے لئے انتھک محنت کی۔ کارکنوں نے بھی ہر جگہ زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ اتفاق و اتحاد کا
یہ عالم تھا کہ 16 سیٹوں پر ممبران بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ صرف وادی کے پانچ حلقوں میں مقابلہ ہوا۔ یہاں مسلم
کانفرنس کے تین اُمیدواروں کے مقابلے میں میرواعظ مولانا یوسف شاہ کی جماعت آزاد پارٹی مسلم کانفرنس نے 3
امیدوار خواجہ عبدالاحد فاروقی (بمقابلہ مولوی محمد عبداللہ وکیل) خواجہ سعدالدین شال (بمقابلہ خواجہ غلام محمد صادق) اور
مقبول شاہ (بمقابلہ سید حسین شاہ جلالی) کھڑے کیے، لیکن اُنہیں مسلم کانفرنس کے اُمیدواروں نے زبردست
شکست دی۔ اس سے میرواعظ مولانا یوسف شاہ اور ان کی جماعت کو وادی کے مسلم حلقوں میں زبردست دھچکا لگا۔
کشیدگی کی اس فضا سے وادی میں یہ پہلا انتخابی معرکہ بہت دلچسپ رہا۔ اس میں "شیر بکرا" معرکہ آرائیاں بھی ہوئیں۔
سیاسیات کشمیر میں مسلمانوں کے مثالی اتحاد میں دراڑیں پڑ گئیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس پہلے انتخابی معرکے میں آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے سیکرٹری جنرل
چوہدری غلام عباس شریک نہ ہوئے نہ ہی وہ اس آئینی جدوجہد کے حق میں تھے۔ چوہدری صاحب اپنی سوانح عمری
"کشمکش" میں اس انتخابی عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میری حالت اسیری میں انتخابات بھی ہوئے اور شیخ محمد عبداللہ نے اپنے حلقہ اثر میں انتخابات میں اُمیدوار
کھڑے کر کے انتخابی مہم میں پوری دلچسپی بھی لی۔ جب جیل میں مجھے شیخ محمد عبداللہ کے اس طرز عمل کا علم ہوا تو
بحیثیت اسیر میرے دل و دماغ پر جو گزری وہ میں ہی جانتا ہوں"۔

(چوہدری غلام عباس "کشمکش" صفحہ 117)

جموں کشمیر پرجا سبھا 1934ء کے مسلم وغیر مسلم منتخب ممبران

نمبرشمار	نام	حلقہ
۱۔	خواجہ ولی محمد	سرینگر
۲۔	مولوی محمد عبداللہ وکیل	//
۳۔	آغا سید حسین شاہ جلالی	//
۴۔	خواجہ احمد اللہ شہداد	//
۵۔	خواجہ غلام محمد صادق	//
۶۔	خواجہ ثناء اللہ شاہ	ہندواڑہ
۷۔	خواجہ غلام حسن ملک	کلگام
۸۔	خواجہ غلام محی الدین	بڈگام
۹۔	خواجہ سیف الدین شاہ	بارہمولہ
۱۰۔	مرزا محمد افضل بیگ	اسلام آباد
۱۱۔	خواجہ محمد اکبر ڈار	پلوامہ
۱۲۔	میاں احمد یار خان	مظفرآباد
۱۳۔	سردار فتح محمد خان کریلوی	پونچھ
۱۴۔	خان محمد خان	پونچھ
۱۵۔	شیخ محمد امین	جموں
۱۶۔	چوہدری عبداللہ خان	رنبیر سنگھ پورہ
۱۷۔	چوہدری عبدالکریم	میرپور
۱۸۔	میاں قربان احمد	کٹھوعہ
۱۹۔	راجہ مروت خان	بھمبر
۲۰۔	کرنل عبدالرحمٰن خان	اودھمپور
۲۱۔	میجر عطا محمد خان	ریاسی

ہندو نمائندے

۱۔	پنڈت امرناتھ کاک	سرینگر
۲۔	پنڈت جیالال کلم	سرینگر

۳۔	پنڈت گوبند رام	بارہ مولا
۴۔	لالہ امرناتھ کوہلی	جموں
۵۔	پنڈت دیوراج شاستری	جموں
۶۔	لالہ ہنس راج وکیل	جموں
۷۔	کوتوال لکھی رام	بھدرواہ
۸۔	وزیر گنگا رام	ریاسی
۹۔	پنڈت رام چند ڈوبے	کٹھوعہ
۱۰۔	بخشی موتی رام	میرپور

سکھ نمائندے

۱۔	سردار کنہیا سنگھ	کشمیر
۲۔	سردار بدھ سنگھ	میرپور، پونچھ

ریاستی اسمبلی پرجا سبھا کا افتتاحی اجلاس 17 اکتوبر 1934ء کو شیر گڑھی سرینگر میں شروع ہوا۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور وزیراعظم کرنل کالون اس موقع پر موجود تھے۔ وزیراعظم نے اسمبلی کے قواعد وضوابط جنہیں ''ریگولیشن نمبر1، 199 بکرمی کا نام دیا گیا پڑھ کر سنائے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے افتتاحی خطاب کیا اور کہا:

''ہمیں اپنی رعایا سے جو محبت اور شیفتگی ہے اس سے مجبور ہو کر ہم نے آپ کو ملک و رعایا کی بہبودی کے لئے دعوت دی ہے۔ ہم نے آپ کے فرائض آپ کے سپرد کر دیئے ہیں اور اس خدمت گزاری کا تعین کر دیا ہے جو آپ اپنے ہم وطنوں کے لئے سرانجام دیں گے اور اس حکمران کی اطاعت گزاری کی جائے گی جو اپنی رعایا کے حقوق وواجبات کا نگہبان ہے''۔ (روزنامہ انقلاب لاہور 20 اکتوبر 1934ء)

اسمبلی کا یہ افتتاحی اجلاس 2 نومبر تک جاری رہا۔ ممبران کو چونکہ قانون سازی کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس لئے دوران سیشن دلچسپ تقاریر اور گفتگو جاری رہی۔ سرینگر سے تعلق رکھنے والے ایک ممبر اسمبلی خواجہ احمد اللہ شہداد کے اس شعر سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

گلانسی کمیشن سے مقصود پایا
یہ سب رنگ لایا میاں شیر کشمیر

ممبران کو دوران اجلاس پانچ روپے یومیہ کے حساب سے الاؤنس دیا گیا۔ مسلم اور غیر مسلم نمائندگان کا ایک ساتھ مل بیٹھ کر اپنے مسائل اور معاملات زیر بحث لانے کا یہ پہلا موقع تھا جس نے ریاست کی آئندہ سیاسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

شیخ محمد عبداللہ پرجا سبھا کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایوان کے فرش پر مسلمان اور ہندو نمائندوں نے جب اپنے اپنے نقطہ نگاہ کو پیش کیا تو ان کے باہمی غلط فہمی اور بدگمانی کی دھند چھٹنے لگی۔ یہ احساس عام ہونے لگا کہ دراصل مقابلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ ظالموں اور مظلوموں کے درمیان ہے۔ چنانچہ غیر مسلم اور مسلم ممبران سبھا ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔''

(شیخ محمد عبداللہ ''آتش چنار'' ص148 ایڈیشن 2008ء)

اسی افتتاحی سیشن کے دوران مسلم کانفرنس کے ممبران اسمبلی نے مظفر آباد کے حلقے سے منتخب ہونے والے ممبر اسمبلی میاں احمد یار خان کو اپنا پارلیمانی لیڈر چن لیا اور مرزا محمد افضل بیگ کو ڈپٹی لیڈر۔ میاں احمد یار خان نے اس موقع پر اپنی تقریر میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

''اس وقت جو ڈھانچہ پیش کیا گیا اور جو آئین ہمارے سامنے رکھا گیا اس سے بہتر آئین کے ریاستی عوام مستحق ہیں۔''

اسمبلی انتخابات 1938ء

1934ء کو معرضِ وجود میں آنے والی اسمبلی کی تین سالہ مدت 31 دسمبر 1937ء کو ختم ہوئی تو مہاراجہ ہری سنگھ نے ممبران اسمبلی کی مشاورت سے چند ماہ کے لئے اس کی مدت میں اضافہ کر دیا۔ چنانچہ نئی اسمبلی کا انتخاب جنوری 1938ء کو ہوا۔

انتخابی معرکہ

دسمبر 1937ء میں پہلی اسمبلی کی مدت ختم ہونے کے ساتھ ہی مسلم کانفرنس نے انتخابات کی تیاری شروع کر دی۔ اُمیدواران کو تیاری کے لئے مناسب وقت بھی مل گیا تھا۔ اس انتخابی معرکے میں مسلم کانفرنس نے ایک ذمہ دار نظامِ حکومت کے نفاذ کا منشور پیشِ نظر رکھا۔ اس بار آزاد پارٹی مسلم کانفرنس کا کوئی اُمیدوار سامنے نہ آیا کیونکہ یہ پارٹی پہلے ہی اپنا بوریا بستر سمیٹ چکی تھی۔ مسلم کانفرنس کی قوت کو توڑنے اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کے لئے اس بار ''گوجر جاٹ کانفرنس'' کے نام سے ایک جماعت منظرِ عام پر لائی گئی۔ گذشتہ انتخابات میں وادی کشمیر میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ اب کی بار صوبہ جموں میں مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے اور ملی یکجہتی کے بجائے مسلمانوں میں برادریوں اور قبیلوں کے تعصبات کو ہوا دینے کے لئے ایک طرف حکومت نے اہم کردار ادا کیا اور دوسری طرف پسماندہ اور گنوار ذاتوں کے نمائندوں نے اپنے قد کاٹھ بڑھانے کے لئے یہ راستہ اختیار کیا۔

چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

''مہاراجہ نے یہ مناسب خیال کیا کہ جموں کے صوبے میں جاٹوں اور گوجروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو مسلم کانفرنس کو زک پہنچانا مقصود تھا، دوسری طرف ان پسماندہ طبقات یعنی جاٹ، گوجر کو اُن کا مقصود تھا، جو راجوں اور جاگیرداروں کے بے رحمانہ سلوک کے ستائے ہوئے تھے''۔

(چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ ''جموں کشمیر کی جنگ آزادی کی کہانی، تاریخ کی زبانی'' صفحہ 115)

چوہدری غلام عباس اس صورتحال کی نشاندہی یوں کرتے ہیں:

''چند حلقہ ہائے انتخاب کے سوا ریاست بھر میں دو دو تین تین اُمیدوار حکومت کی شہ اور اعلانیہ مدد سے ہر حلقہ انتخاب میں ہمارے خلاف کھڑے کر دیئے گئے۔ صوبہ جموں میں گوجر، جاٹ اور راجپوت وغیرہ کی لعنت تو موجود ہی تھی۔ حکومت کے کارندوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو خوب ہوا دی۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس انتخابی جنگ میں یہ قومیں آپس میں گتھم گتھا ہو کر اور ٹکرا کر خود ہی فنا ہو جائیں گی''۔

(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 145)

صوبہ جموں میں چوہدری غلام عباس، اے آر ساغر اور چوہدری حمید اللہ کی قیادت میں مسلم کانفرنس نے انتخابی مہم کی۔ صوبہ جموں میں دور دراز مقامات اور شدید گرمی کے باعث یہ مہم اور زیادہ مشکل ہو گئی تھی۔ وادی کشمیر میں حالات قدرے مختلف تھے۔ یہاں زیادہ مشکل مظفر آباد کے حلقے میں تھی کیونکہ یہ دور دراز اور پسماندہ علاقہ تھا۔ اندرونِ وادی میں مسلمانوں کی کوئی دوسری جماعت بھی میدان میں نہیں تھی۔ کچھ جاگیرداروں اور حکومتی وفاداروں نے مسلم کانفرنس کارکنوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اکثر اُمیدواروں کو بری طرح شکست ہوئی اور ان کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ اس الیکشن میں مسلم کانفرنس نے تمام اکیس حلقوں میں اپنے اُمیدوار کھڑے کیے۔ اُسے 19 نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ صرف دو حلقوں سے مسلم کانفرنسی اُمیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد ہو گئے تھے۔ ان حلقوں میں میرپور سے چوہدری عبدالکریم اور بڈگام سے پیر ضیاء الدین اندرابی آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے انتخاب جیت گئے۔ یہ دونوں ممبران کامیابی کے بعد مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ یوں مسلم کانفرنس کو اکیس کی اکیس نشستیں مل گئیں۔ ان انتخابی نتائج سے ایک بار پھر واضح ہو گیا کہ ریاست جموں کشمیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس ہے اور مسلمانانِ ریاست اس جماعت پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔

جموں کشمیر پرجا سبھا 1938ء کے مسلم و غیر مسلم منتخب ممبران

نمبرشمار	نام ممبر	حلقہ
۱۔	اللہ رکھا ساغر	جموں شہر
۲۔	چوہدری حمید اللہ	جموں وزارت
۳۔	مرزا عطا اللہ	ریاسی
۴۔	شیخ محمد امین	کٹھوعہ
۵۔	چوہدری عبدالکریم	میرپور
۶۔	سردار فتح محمد خان کریلوی	پونچھ
۷۔	صوبیدار خان محمد خان	پونچھ
۸۔	لیفٹیننٹ راجہ فضل الرحمٰن	بھمبر
۹۔	مولوی غلام مصطفیٰ	مظفر آباد
۱۰۔	محمد خلیل کچلو	اودھم پور
۱۱۔	میاں احمد یار خان	سرینگر
۱۲۔	آغا سید حسین شاہ جلالی	سرینگر
۱۳۔	خواجہ احمد اللہ شہداد	سرینگر
۱۴۔	خواجہ غلام محمد صادق	سرینگر
۱۵۔	ایم اے حفیظ	سرینگر
۱۶۔	خواجہ محمد اکبر ڈار	پلوامہ
۱۷۔	مرزا محمد افضل بیگ	اسلام آباد
۱۸۔	خواجہ غلام محمد بٹ	بڈگام
۱۹۔	خواجہ غلام نبی	کلگام
۲۰۔	قاضی عبدالغنی دلنہ	بارہ مولا
۲۱۔	صوفی محمد اکبر	ہندواڑہ

ہندو نمائندے

۱۔	ڈاکٹر بلرام داس	جموں
۲۔	لالہ دیناناتھ	جموں
۳۔	چوہدری پھمن سنگھ	جموں
۴۔	وزیر گنگارام	ریاسی
۵۔	لالہ اجودھیا ناتھ	میرپور
۶۔	پنڈت امرناتھ کاک	سرینگر
۷۔	پنڈت شیو نرائن	سرینگر
۸۔	پنڈت رگھو کابل	سرینگر
۹۔	شیولال	اودھم پور
۱۰۔	چوہدری عطر سنگھ	کٹھوعہ

سکھ نمائندے

۱۔	سردار کھڑپال سنگھ	کشمیر
۲۔	سردار بدھ سنگھ	میرپور پونچھ

منتخب اسمبلی کا پہلا اجلاس راج گڑھ محل سرینگر میں 7 ستمبر 1938ء کو شروع ہوا۔ مسلم کانفرنس کے ممبران اسمبلی نے حسبِ سابق میاں احمد یار کو اسمبلی میں پارٹی لیڈر نامزد کیا اور مرزا افضل بیگ کو بھی حسب سابق ڈپٹی لیڈر نامزد کیا گیا۔

اسمبلی انتخابات 1947ء

28 نومبر 1946ء کو والئی ریاست مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک خصوصی فرمان جاری کیا، جس کی رو سے سابقہ اسمبلی کو برخاست کر دیا گیا اور جموں کشمیر پرجا سبھا کے لئے انتخابات کے اعلان کے ساتھ انتخابی شیڈول کا بھی اعلان کیا گیا۔ اعلان کے مطابق 7 دسمبر 1946ء کو کاغذات نامزدگی داخل کروائے جانے تھے۔ 19 دسمبر 1946ء تک ان کی جانچ پڑتال ہونا تھی اور 4 جنوری کو ووٹنگ کا دن تھا۔ سرحدی صوبہ لداخ و گلگت کے لئے ووٹنگ کی تاریخ 11 جنوری 1947ء رکھی گئی۔

انتخابی معرکہ

اس بار اسمبلی کے انتخابات کے لئے جس موسم کا انتخاب کیا گیا تھا یہ موسم ریاست جموں کشمیر کے اکثر علاقوں میں شدید سرد ہوتا ہے۔ شدید سردی، بارش اور برف باری کے سبب یہ موسم انتخابی مہم کے لئے کسی طور بھی مناسب نہیں تھا، اس کے باوجود انتخابات کے شیڈول کا اعلان ہوتے ہی عوام میں بھی خاصا جوش و خروش پیدا ہو گیا اور سیاسی جماعتوں نے بھی دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اب انتخابی عمل عوام کے لئے خاصی دلچسپی کا باعث بن چکا تھا۔ لوگ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرنے اور انہیں پرجا سبھا میں بھیجنے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھنے لگے تھے۔ اُمیدواران بھی اسے ایک قومی فریضہ سمجھتے ہوئے نبھانے پر آمادہ تھے۔

اس بار انتخابی معرکے کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی ریاست
جماعت آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ اوّل تو اس کی قیادت دو حصوں میں تقسیم
مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس میں ڈھل چکی تھی۔ دوم اس جماعت کے ساتھ تازہ ترین سانحہ یہ پیش آ چکا تھا کہ
جماعت چوہدری غلام عباس اور ان کے چند سرکردہ ساتھی 25 اکتوبر کو تحریکِ عدم تعاون کی پاداش میں پس دیوارِ زنداں
جا چکے تھے۔ ان راہنماؤں کی گرفتاری کے بعد جماعتی قیادت کے مسئلے پر مسلم کانفرنس دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔
میں سے ایک دھڑے کی قیادت چوہدری حمید اللہ خان کے پاس تھی۔ اس دھڑے کا اثر و رسوخ صوبہ جموں میں
تھا۔ دوسرے دھڑے کی قیادت میر واعظ مولانا یوسف شاہ کر رہے تھے۔ مولانا کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلم کانفرنس
کانفرنس کے قالب میں ڈھلنے کے بعد 1942ء میں مسلم کانفرنس کو دوبارہ زندہ کرنے میں چونکہ ان کا بنیادی اور
کردار رہا ہے، اس لئے چوہدری غلام عباس کی گرفتاری کے بعد قائمقام صدر بننے کے حقدار وہی ہیں۔ میر واعظ کی
قیادت مسلم کانفرنس کا یہ دھڑہ وادی میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔

اس اندرونی خلفشار کے سبب مسلم کانفرنس کو انتخابی مہم میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلم کانفرنس
سرینگر، بارہ مولا، اننت ناگ، جموں، راجوری، پونچھ، ریاسی، مہنڈر اور بھمبر سے اُمیدوار کھڑے کیے۔ ان حلقوں
چوہدری حمید اللہ اور میر واعظ مولانا یوسف شاہ نے اپنی اپنی پسند کے اُمیدوار سامنے لائے۔ ان اُمیدواروں نے ایک
دوسرے کو اصلی اور جعلی مسلم کانفرنسی ہونے کے طعنے دیئے۔ مسلم کانفرنس کے اس انتشار سے حکومت نے اور مخالف
جماعتوں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اسی دوران مسلم کانفرنس کے قائمقام صدر چوہدری حمید اللہ خان نے 27 دسمبر کو کراچی
مسلم لیگ کے راہنما محمد علی جناح سے ملاقات کی اور اُنہیں ریاستی صورتحال سے آگاہ کیا۔ قائداعظم نے ریاستی صورتحال
تبصرہ کرتے ہوئے جہاں حکومت کشمیر پر تنقید کی، وہاں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس آڑے وقت میں جبکہ
حکومت ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور دوسری طرف ریاست کشمیر میں انتخابات ہو رہے ہیں
ایجی ٹیشن کر کے جیل چلے جانا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے۔ محمد علی جناح نے مسلم کانفرنس کے اراکین کو ہدایت کی کہ
چوہدری غلام عباس کی غیر موجودگی میں اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ کریں اور انتخابات میں جماعتی کامیابی کے لئے کوشش کریں۔

حالات نہایت نا مساعد تھے، اس کے باوجود مسلم کانفرنس نے بھرپور مہم جاری رکھی۔ مسلم کانفرنس کے
اُمیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد ہو گئے۔ اس پر مسلم کانفرنس کے پارلیمانی بورڈ کے صدر سید علی احمد شاہ نے
تنقید کی اور حکومت پر الزام لگایا کہ وہ سرکاری حمایت یافتہ اُمیدواروں کو کامیاب کروانے میں پیش پیش ہے۔
جماعت چوہدری حمید اللہ خان نے وزیراعظم رام چند کاک پر جانبداری کا الزام لگاتے ہوئے اس کی برطرفی کا مطالبہ
کیا۔ اس الیکشن میں حکومت کی شہ پر ایک ایک حلقے نے مسلم کانفرنس کے اُمیدواروں کو شکست دینے کے لئے کئی
اُمیدوار سامنے آ گئے۔

ادھر سرینگر میں میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور ان کے حامیوں کو بھی انتخابی مہم میں سخت مشکل صورتحال کا سامنا

تھا۔ یہاں جن اُمیدواروں کو میر واعظ یوسف شاہ نے ٹکٹ جاری کیے، ان کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے۔ چنانچہ
اس مخدوش صورتحال کو دیکھتے ہوئے میر واعظ یوسف شاہ نے عین وقت پر الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

سردار محمد ابراہیم خان جو پونچھ کی تحصیل سدھنوتی و باغ سے مسلم کانفرنس کے ٹکٹ ہولڈر تھے، اُنہوں نے
اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وزیر پونچھ بھیم سین نے اُنہیں ہرانے کے لئے اپنا ایک حمایت یافتہ اُمیدوار سردار نسیم
خان سامنے لایا۔ اس کے علاوہ ایک اور آزاد اُمیدوار سردار یاسین خان بھی اُن کے مقابلے میں کھڑا ہوا، لیکن دونوں کی
ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

سردار ابراہیم خان نے اس انتخابی معرکے کی منظر کشی یوں کی ہے:

"4 جنوری کو جس دن ووٹ پڑنے کا دن تھا، طوفانی برف اور بارش ہوئی۔ انسانوں کا گھروں سے باہر قدم رکھنا
ایک جہاد کا کام تھا، مگر سارا علاقہ آیا۔ مختلف پولنگ اسٹیشنوں پر لوگوں نے آ کر ووٹ ڈالے۔ جس تکلیف میں
یہ لوگ ووٹ ڈالنے آئے، اس کا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ چار بوڑھے واپس جاتے ہوئے سردی کی
شدت سے فوت ہو گئے۔ علاقہ پلندری (جو تحصیل سدھنوتی کا ایک حصہ ہے) کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک
عورت نے اپنے خاوند کو زبردستی ووٹ ڈالنے بھیجا۔ جب مرد نے لیت و لعل کی تو عورت نے اُسے کہا کہ تمہاری
بیوی نہیں رہوں گی اور تم کو روٹی اپنے ہاتھ سے پکا کر نہیں دوں گی، اگر جا کر ووٹ ڈال کر نہ آؤ گے اور ووٹ
ڈالنے کے دو گواہ ساتھ نہ لاؤ گے۔ اس جذبے کے ساتھ میرے لئے لوگوں نے ووٹ ڈالے تھے"۔

(سردار محمد ابراہیم خان "متاعِ زندگی" صفحہ 137 ایڈیشن اوّل)

مذکورہ بالا موافق و نا موافق حالات کے ملے جلے ماحول میں مسلم کانفرنس نے 21 میں سے 15 نشستوں پر
کامیابی حاصل کی۔ ان پندرہ نشستوں میں وہ ممبران بھی شامل تھے جو آزادانہ حیثیت سے الیکشن لڑے اور جیت کر مسلم
کانفرنس میں شامل ہو گئے۔

نیشنل کانفرنس نے بھی ان انتخابات میں بھرپور حصہ لیا اور اس نے کئی اضلاع میں اپنے اُمیدوار کھڑے
کیے۔ صدر جماعت شیخ محمد عبداللہ اور ان کے چند ساتھی "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کی پاداش میں اگرچہ پس دیوارِ زنداں
تھے، لیکن جماعت کی جو قیادت آزاد تھی، اس نے اپنے قائدین کی ہدایت پر تمام حلقہ ہائے انتخاب میں اُمیدوار کھڑے
کرنے کا اعلان کیا اور یہ عندیہ ظاہر کیا کہ موزونیت کے مطابق مسلم یا غیر مسلم اُمیدوار کھڑے کیے جائیں گے۔ چنانچہ
ایک ایک حلقے میں کئی کئی آزاد اور گرفتار اُمیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کروائے۔

اس انتخابی مہم میں چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے قائدین مسلم کانفرنس کی کھل کر حمایت کر رہے تھے۔
اس لئے آل انڈیا کانگریس نے بھی نیشنل کانفرنس کی کھل کر حمایت کی اور اس کے کچھ قائدین نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم
میں شریک بھی رہے۔ آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے قائمقام صدر پٹا بھی نے کشمیری عوام سے اپیل کی کہ وہ نیشنل
کانفرنس کو کامیاب بنائیں۔ مسز ارونا آصف علی اور آغا شورش کاشمیری نے نیشنل کانفرنس کے انتخابی جلسوں میں حصہ لیا
اور اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ نیشنل کانفرنس کے کئی اُمیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کیے جانے کے بعد

حکومت نے مختلف حیلوں بہانوں سے نیشنل کانفرنس کے انتخابی بورڈ کے ممبران کو بھی گرفتار کر لیا۔ نیشنل کانفرنس کے امیدوار شمبھو ڈاکٹر پشن نے مہاراجہ ہری سنگھ کو خط لکھا کہ وزیراعظم رام چند کاک نے اپنے بھائی کو الیکشن میں کامیاب کروانے کے لئے اس کے ووٹوں کو ڈرایا دھمکایا ہے اور ناجائز حربے استعمال کیے ہیں۔ اس انتخابی مہم میں جب حکومت کی جانبداری کھل کر سامنے آگئی تو نیشنل کانفرنس کی الیکشن کمیٹی کے ممبر سید میر قاسم نے انتخابات سے صرف دن قبل خواجہ غلام محمد صادق اور بخشی غلام محمد کی ہدایت پر الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا۔

اس الیکشن کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے علاوہ اس بار کئی اور سیاسی اور پارٹیاں بھی میدان سیاست میں اُتر چکی تھیں۔ ان جماعتوں میں کسان مزدور کانفرنس، سوشلسٹ پارٹی، کشمیری پنڈت کانفرنس، ہندو راجیا سبھا، اکالی پارٹی اور آل جموں کشمیر سٹیٹ پیپلز کانفرنس شامل تھیں۔ آخر الذکر جماعت وزیراعظم رام چند کاک نے قائم کروائی تھی۔ اس کا صدر وادی کا ایک متوسط زمیندار ملک غلام مصطفےٰ تھا، جو انتہائی ناگ... والا تھا اور حکومت کے بہی خواہوں میں شمار ہوتا تھا۔ وادی میں اس جماعت کے اُمیدواروں کو کامیاب کروانے کے لیے رام چند کاک نے بھرپور کوشش کی۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کو نیچا دکھانے کے لئے اس جماعت کو کاک... مہرے کے طور پر استعمال کیا۔

اس انتخابی مہم میں عبدالسلام یاتو اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کی قیادت میں کسان مزدور کانفرنس نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ اس جماعت نے نیشنل کانفرنس کو نہایت مشکل صورتحال سے دوچار کر دیا۔ جس کا فائدہ بالآخر حکومت کو ہوا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز ان انتخابات کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"The nomination papers of most of the Gover nment critics were rejected. On the day of the poll, 4th January, 1947, bundles of voting papers were distributed among the agents of Kak who put them in the boxes of the Government supporters with impunity. From one end to the other the polling booths were infested with Kak's men persuading and intimidating people to vote for the loyalists. It was reported that the ballot boxes were also tampered with which is not surprising. The election was a complete farce. The composition of the Legislative Assembly thus elected can be imagined. The Nationalists decided to boycott the elections at the eleventh hour obviously feeling convinced that there was not a ghost of chance for any of their candidates to succeed. But they did not sit quietly. On the polling day they organized groups of ruffians to attack candidates of other parties taking part in the elections and to intimidate and beat people going to vote."

(پنڈت پریم ناتھ بزاز "*The History of Struggle for Freedom in Kashmir*" صفحہ 268)

1947ء کے انتخابی معرکے کے نتیجے میں جو اسمبلی معرض وجود میں آئی اس کا پہلا اجلاس مارچ 1947

جموں میں ہوا، کیونکہ ریاستی دارلحکومت ان دنوں جموں میں کام کر رہا تھا۔ یہ انتخابی معرکہ اور یہ قانون ساز اسمبلی متحدہ ریاست جموں کشمیر کا آخری الیکشن اور آخری اسمبلی ثابت ہوئے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ریاست جموں کشمیر پہلے قبائلی حملہ آوروں اور پھر ہندوستانی افواج کی جارحیت کا شکار ہوئی اور اس کی وحدت وسالمیت پارہ پارہ ہوگئی۔ مسلمانانِ جموں کشمیر کی قربانیوں بھری جدوجہد ایک ایسے المیے سے دوچار ہوئی، جس نے نت نئے المیوں کو جنم دیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی غلط فہمیوں، وزیراعظم رام چند کاک کی خوش فہمیوں اور مسلم کانفرنسی راہنماؤں کی خود غرضیوں، مفاد پرستیوں اور فہم وفراست سے عاری پالیسیوں نے جو ناٹک رچایا اس نے آزاد، خوشحال اور جمہوری ریاست جموں کشمیر کے قیام کا وہ خواب چکنا چور کر دیا جسے لاکھوں انسانوں نے اپنی پلکوں پر سجا رکھا تھا۔

جموں کشمیر پرجا سبھا 1947ء کے کل ممبران

منتخب مسلم ممبران

۱۔ چوہدری حمیداللہ خان	(جموں شہر)	۲۔ چوہدری غلام مصطفیٰ	(جموں وزارت)
۳۔ چوہدری صاحب دین	(کٹھوعہ)	۴۔ مرزا محمد حسین	(ریاسی)
۵۔ ملک غلام محمد	(اودھم پور)	۶۔ سردار محمد ابراہیم خان	(پونچھ)
۷۔ سردار یار محمد خان	(پونچھ)	۸۔ غلام محمد جیولر	(سرینگر)
۹۔ خواجہ حبیب اللہ	(ہندواڑہ)	۱۰۔ ملک غلام مصطفیٰ	(اسلام آباد)
۱۱۔ چوہدری محمد یوسف خان	(میرپور، کوٹلی)	۱۲۔ چوہدری خورشید احمد	(بھمبر)
۱۳۔ میاں احمد یار خان	(مظفرآباد)	۱۴۔ خواجہ محمد اقبال چاپری	(سرینگر)
۱۵۔ آغا سید احمد شاہ	(بڈگام)	۱۶۔ عنایت اللہ ککرو	(بارہ مولا)
۱۷۔ خواجہ غلام نبی گلکار	(سرینگر)	۱۸۔ مولوی محمد عبداللہ	(شوپیاں)
۱۹۔ صفدر علی	(بڈگام)	۲۰۔ عبدالغنی	(تاشواں)
۲۱۔ حکیم محمد صادق	(رعناواری)		

مخصوص نشستوں پر کامیاب ہونے والے ممبران

۲۲۔ کرنل سنار سنگھ	(تعلیمی حلقہ جموں)	۲۳۔ ٹھاکر کرتار سنگھ	(تعلیمی حلقہ کشمیر)
۲۴۔ راجہ فضل الرحمٰن	(جاگیردار صوبہ جموں)	۲۵۔ پنڈت بلہ کاک در	(جاگیردار صوبہ کشمیر)
۲۶۔ چوہدری بیربل	(زمیندار صوبہ جموں)	۲۷۔ پنڈت دینا ناتھ کلم	(زمیندار صوبہ کشمیر)
۲۸۔ ٹھاکر حقیقت سنگھ	(پنشن یافتہ)		

منتخب غیر مسلم ممبران

۲۹۔ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ	(جموں شہر)	۳۰۔ لالہ گوپال منگی	(جموں شہر جنوبی)
۳۱۔ کیپٹن گندھرب سنگھ	(جموں)	۳۲۔ ٹھاکر دھنتر سنگھ	(اودھمپور)
۳۳۔ وزیر گنگا رام	(ریاستی وزارت)	۳۴۔ ٹھاکر داس ملہوترا	(کٹھوعہ)

۳۵۔ چوہدری رام لال	(میرپور)	۳۶۔ پنڈت امرناتھ کاک	(سرینگر)
۳۷۔ شیونرائن فوطیدار	(سرینگر)	۳۸۔ پنڈت جانکی ناتھ	
۳۹۔ سردار گلبیر سنگھ	(میرپور پونچھ)	۴۰۔ سردار بلدیو سنگھ	(مغربی کشمیر)

نامزد مسلم وغیر مسلم ممبران

۴۱۔ سردار بلونت سنگھ	(ترال)	۴۲۔ کیپٹن ایس سردار سنگھ	(رنبیر سنگھ)
۴۳۔ یکبو فتح علی خان	(اسکردو)	۴۴۔ یکبو احمد اللہ خان	(کرگل)
۴۵۔ راجہ سلطان محمد شاہ	(استور)	۴۶۔ عزیز راتھر	(بارہ مولا)
۴۷۔ عبدالاحد نشاطی	(سرینگر)	۴۸۔ میاں عبدالرشید	(کرناہ)
۴۹۔ کرنل عبدالرحمن	(جموں)	۵۰۔ میاں نظام الدین	(وانگٹ)
۵۱۔ محمد اقبال چاپری	(سرینگر)	۵۲۔ راجہ کرم داد خان	(کوٹلی)
۵۳۔ سید رسول شاہ جلالی	(سرینگر)	۵۴۔ شیخ عبدالمجید	(جموں)
۵۵۔ چودنگ رتنچن	(لیہہ، لداخ)	۵۶۔ صونم ٹرزن	(لداخ)
۵۷۔ باوا بھوشن داس	(جموں)	۵۸۔ منگت رام	(اودہم پور)
۵۹۔ لالہ نانک چند	(سرینگر)	۶۰۔ پنڈت بلم بیرکول	(چینی)
۶۱۔ لالہ شیوناتھ نندا	(جموں)	۶۲۔ پنڈت گنگاناتھ	(اودہم پور)
۶۳۔ لالہ دیناناتھ مہاجن	(جموں)	۶۴۔ پنڈت جناردھن ٹینگ	(سرینگر)
۶۵۔ ایل رام لال شاہ	(مظفرآباد)	۶۶۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ	(جموں)
۶۷۔ کیپٹن دیوی داس	(ترارکھل، پونچھ)	۶۸۔ چیف سیکرٹری	
۶۹۔ اکاؤنٹنٹ جنرل		۷۰۔ وزیر آف پونچھ	
۷۱۔ سیکرٹری ٹو گورنمنٹ ہوم		۷۲۔ سیکرٹری ٹو گورنمنٹ ریونیو	

۷۳ تا ۷۵ تین نشستیں سرکاری حکام کے لئے مخصوص رکھی گئیں۔

8

آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس

پسِ منظر
اسباب و محرکات
قیام
دستورِ اساسی

اکتوبر 1932ء میں مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمانانِ ریاست کی یہ نمائندہ جماعت انتشار وخلفشار کا شکار ہوگئی۔ جماعت کی دو اہم شخصیات میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور شیخ محمد عبداللہ کے مابین قیادت اور عوامی نمائندگی کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہوگئے۔ حسد اور رقابت کے بڑھتے ہوئے جذبات نے "شیر بکرا لڑائی" کو فروغ دیا۔ بالآخر سات ماہ کے مختصر عرصے کے بعد 16 مئی 1933ء کو میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور ان کے حامیوں نے مسلم کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر لی اور "آزاد پارٹی مسلم کانفرنس" کے نام سے اپنی الگ جماعت قائم کرلی۔ یہیں سے مسلم کانفرنس میں انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوگیا۔

ریاست جموں کشمیر ایک کثیر المذہبی ریاست تھی، جس میں بڑی اکثریت اگرچہ مسلمانوں کی تھی، لیکن مسلمانوں کا غیر مسلموں سے سلوک اور برتاؤ نہایت اچھا تھا۔ غیر مسلم بھی مسلمانوں سے دوستانہ برتاؤ کرتے۔ مذہبی رواداری اور بھائی چارے کے مثالی ماحول کے اعتبار سے ہندوستان کی کوئی بھی ریاست جموں کشمیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں کشمیر کی تاریخ میں کبھی بھی مذہبی فساد رونما نہیں ہوا۔ ریاست کا صوبہ جموں ہندوستانی پنجاب سے ملحق تھا اور پنجاب میں آئے روز ایسے واقعات پیش آتے رہتے تھے، جس سے ہندو مسلم تنازعات جنم لیتے۔ ان واقعات کا اثر صوبہ جموں تک بھی پہنچتا اور یہاں بھی کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا جس سے تناؤ کا ماحول پیدا ہوتا۔ صوبہ کشمیر اور گلگت بلتستان میں حالات اس کے برعکس تھے۔ چونکہ یہ علاقے ہندوستان سے دور اور الگ تھلگ تھے، اس لئے یہ بیرونی اثرات سے محفوظ رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے ان خطوں میں مسلم اور غیر مسلم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ وادی کشمیر جو سیاسیاتِ کشمیر کا مرکز تھی، یہاں مسلمانوں اور پنڈتوں کے دوستانہ رشتے صدیوں پرانے تھے۔ ان کا حسب ونسب بھی ایک ہی تھا۔ اسلئے اُنہوں نے مذہبی تفریق کو اپنی معاشرتی زندگی میں کبھی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

جب مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت مسلمانوں کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ ریاست اور والئی

ریاست کے وفادار رہتے ہوئے مسلمانوں کے جائز حقوق کے تحفظ کے لئے جدوجہد کریں گے۔ جب سیاسی جدوجہد شروع ہوئی تو مسلم کانفرنس کے راہنماؤں کو بہت جلد احساس ہوا کہ ان کی جدوجہد مذہبی بنیادوں پر ہونے لگی ہے۔ جس سے ایک طرف مذہبی رواداری اور بھائی چارے کا صدیوں پرانا ماحول تباہ ہو جائے گا اور دوسری طرف حقوق کے حصول کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں تک محدود رہے گی، جس سے لامحالہ حقوق سے محروم دوسرے غیر مسلم طبقات اس میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ریاست کو قومی دھارے میں لا کر اور اسے ریاستی سطح پر تمام محروم و مجبور طبقوں کی مشترکہ جدوجہد کا رنگ دینے کے لئے اس میں غیر مسلموں کو بھی شانہ بشانہ چلایا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ جس زمانے میں مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا اور مسلمانوں نے اپنے حقوق کی جدوجہد سیاسی انداز سے شروع کی، اس وقت ریاست میں ایک مخصوص طبقہ عنایاتِ شاہی سے مستفید ہو رہا تھا، جس میں شخصیت پرست مسلمان اور منظورِ نظر ہندو شامل تھے۔ دوسری طرف غربت، افلاس، جہالت اور پسماندگی میں ڈوبی ہوئی عوام تھی جس میں مسلمان، ہندو، سکھ، پنڈت اور بدھ شامل تھے۔ مسلم کانفرنس کی سیاسی جدوجہد سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم آبادی کے ان محروم طبقات کو بھی زبردست حوصلہ ملا اور وہ بھی مسلمانوں کی اس جدوجہد کی تائید کرنے لگے۔ اس سلسلے میں کشمیری پنڈتوں کے راہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز کا کردار سب سے اہم اور نمایاں ہے جو مسلم کانفرنس کے قیام سے پہلے ہی ریاستی عوام کی جدوجہد کو سیکولر، ترقی پسندانہ اور جمہوری انداز سے آگے بڑھانے کی سوچ رکھتے تھے۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز اس ضمن میں لکھتے ہیں:

A few young Muslim leaders incluaing Abduhhal began to think of re-orientating Muslim politics on broader, healthier and non-communal lines. Abdullah and Prem Bazaz met only two months later on a historic afternoon in July 1932 in the Shahi Garden to thrash out the problem. This meeting proved to be of a great significance. The decisions taken in it by the two after a frank, detailed and heart discussion of the basic issues, have considerably influenced the State politics. It was in this meeting that Abdullah and Bazaz firmly resolved that the Kashmir Freedom Movement will be conducted on secular, progressive and democratic lines. Both of them promised to work together till the goal of complete freedom was achieved.

(پنڈت پریم ناتھ بزاز *"The History of Struggle for Freedom in Kashmir"* صفحہ 164)

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اکتوبر 1932ء کے آخر میں ریاست کا پہلا روزنامہ ''وتستا'' جاری کیا جو سیکولر جمہوری اندازِ فکر کا ترجمان تھا۔ اس اخبار نے ریاست میں ذمہ دار نظامِ حکومت کی فکر کو بھی فروغ دیا۔ اس اخبار کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے 1933ء کے اوائل میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد یہ تھا کہ

مسلموں اور غیر مسلموں میں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم رکھنے کیلئے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ اگرچہ یہ کمیٹی کوئی نمایاں کام نہ کرسکی، لیکن اس نے ریاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مشترکہ سیاسی جدوجہد کی طرف مائل کیا۔

1934ء میں جموں کشمیر پرجا سبھا کا قیام عمل میں آیا تو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور بدھوؤں کے رہنماؤں کو ایک ساتھ مل بیٹھنے اور باہمی مسائل و مشکلات پر غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔ اس سے بھی سیاسی رواداری اور مشترکہ سیاسی جدوجہد کے رجحانات کو تقویت ملی۔

یکم اگست 1935ء کو پنڈت پریم ناتھ بزاز اور شیخ محمد عبداللہ نے ایک اُردو ہفت روزہ ''ہمدرد'' کا اجراء کیا۔ اس اخبار نے سیاسیات کشمیر میں نیشنل ازم اور ترقی پسندانہ نظریات کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ ہفت روزہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یکساں مقبول تھا۔ مسلم کانفرنس کے سیاسی نظریات میں تبدیلی برپا کرنے میں اس اخبار نے تاریخی کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر سلام الدین نیاز لکھتے ہیں:

''ہفت روزہ ''ہمدرد'' کے اجراء کے بعد دونوں مصاحبوں کی توجہ مسلم کانفرنس کے راہنماؤں کو مشرف بہ ''نیشنلزم'' کرنے میں صرف ہونے لگی اور جب اس کے لئے فضا سازگار نظر آنے لگی تو سب سے پہلے شیخ صاحب نے چوہدری غلام عباس سے اس کے متعلق گفتگو کی''۔ (ڈاکٹر سلام الدین نیاز ''ان کہی داستانِ کشمیر'' صفحہ 466)

ہندوستان میں یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے بے چینی، بے یقینی اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ انڈیا ایکٹ 1935ء کے سامنے آنے سے صوبوں اور ریاستوں پر مشتمل ایک وفاقِ ہند کا تصور سامنے آیا تھا جس میں ریاستی باشندوں کے بجائے والیانِ ریاست کو اپنے نمائندے وفاق میں بھیجنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس سے ہندوستان بھر کے ریاستی باشندوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان میں آئینی تبدیلی کے اس موڑ پر مسلمانانِ ہند بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور میاں محمد شفیع اس دنیا سے پردہ فرما چکے تھے۔ علامہ اقبال سیاست سے عملاً کنارہ کش ہو گئے تھے۔ جمعیت علماء ہند، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان اور دیگر بہت سے مسلم زعماء کانگریس کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے۔ پنجاب میں ہندو، مسلمان اور سکھ سر فضل حسین کی یونی نسٹ پارٹی کے پرچم تلے متحد تھے۔ بنگال میں مولوی فضل الحق کرشک پرجا کے پلیٹ فارم سے غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر مصروفِ عمل تھے۔ مولانا حسرت موہانی بیک وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کی راہنمائی کر رہے تھے۔ علامہ عنایت المشرقی، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور چوہدری خلیق الزمان اپنی اپنی ڈفلی بجا رہے تھے۔ مسلم لیگ ایک بے اثر اور بے جان تنظیم کے سوا کچھ نہ تھی نہ ہی اس کو عوام میں کوئی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے برعکس سارے ہندوستان میں کانگریس کا طوطی بول رہا تھا۔ کانگریس سارے ہندوستان کی نمائندگی کا حق ادا کر رہی تھی۔ اس نے متحدہ ہندوستانی قومیت کا جو نعرہ بلند کیا تھا وہ دن بدن فروغ پا رہا تھا۔

ہندوستان کے مذکورہ سیاسی ماحول نے ریاست جموں کشمیر کے نوآموز سیاسی ماحول پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے اور کانگریس کا اندازِ سیاست مسلم کانفرنس کے سرکردہ راہنماؤں کیلئے ایک مثال بن کر سامنے آیا۔ ریاست

میں چونکہ مسلمان اکثریت میں تھے اور غیر مسلم اقلیت میں، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے کوئی خطرہ یا خدشہ نہ تھا
کانفرنس نے غیر مسلم اقلیت کو بھی ساتھ لے کر چلنے کا عزم کیا۔ اس مقصد کیلئے ''ذمہ دار نظام حکومت''
کے لئے مشترکہ جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا۔ چونکہ اس تصورِ حکومت میں مسلموں اور غیر مسلموں کے یکساں
پنہاں تھے، اس لئے ریاست بھر میں غیر متعصبانہ، جمہوری اور تعمیری سوچ رکھنے والے ہندو اور سکھ
اس مطالبے کی حمایت کی:

پنڈت پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں:

"On 8th May 1936 the Muslim Conference Party observed a Responsible Government Day throughout the length and breadth of the State. An appeal had been made by Abdullah, President of the Conference to non-Muslims to participate in the function. This did not go in vain. For, at many places, notably Srinagar, Poonch and Jammu, presidents of the public meetings held in this connection as also the principal speakers at them were either Hindus or Sikhs. "

(پنڈت پریم ناتھ بزاز *"The History of Struggle for Freedom in Kashmir"* صفحہ 167)

جنوری 1938ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس نے مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنانے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ''تحریک رابطہ مسلم عوام'' شروع کی۔ اس تحریک کے دوران لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنڈت جواہر لعل نہرو کی شیخ محمد عبداللہ سے پہلی باضابطہ ملاقات ہوئی۔ پنڈت نہرو نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا ہم سفر بننے کی پیشکش کی اور انہیں صوبہ سرحد کے دورے پر اپنے ساتھ لے گئے۔ انہی ایام میں مئی 1936ء کو مسلم لیگ کے راہنما محمد علی جناح کشمیر کی سیر اور ایک مقدمے کی پیروی کے لئے کشمیر آئے۔ 3 جون کو پتھر مسجد سرینگر کے احاطے میں مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام منعقدہ عید میلاد النبیؐ کے جلسہ میں اُنہوں نے چوہدری غلام عباس کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اپنے ایڈرس میں مجھے ہندو مسلم اتحاد کا دلدادہ ظاہر کیا ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ اتحاد میرے لئے صرف لفظی بیان تک محدود نہیں۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے کہتا ہوں کہ اس کیلئے میں نے سالہاسال کام کیا ہے اور کرتا رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ بغیر اس اتحاد کے برطانوی ہندوستان کے باشندوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے کی کوئی اُمید نہیں۔ میں آپ کے یہاں کے مسائل سے واقف نہیں، اس لئے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کروں گا۔ لیکن ایک بات میں آپ کے اور آپ کے راہنماؤں سے ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اقلیتوں یعنی ریاست کے ہندوؤں کو ہمیشہ یہ احساس دلائیں کہ وہ ریاست میں انصاف اور مساوات حاصل کریں گے۔ (پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 246)

چوہدری غلام عباس خود بتاتے ہیں:

''سپاس نامے کے جواب میں حضرت قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ قلب کریں بلکہ انکو سیاسی گاڑی کا ایک پہیہ سمجھ کر ساتھ چلائیں''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 163)

پنڈت نہرو کے ہمراہ شیخ عبداللہ کا یہ سفر جہاں شیخ کی ذاتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کر گیا، وہاں ریاست کی سیاست بھی نئے راستے پر چل نکلی۔

شیخ عبداللہ اس دورے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پنڈت جی نے مشورہ دیا کہ ہمیں تنظیم کے دروازے ریاست کے ہر باشندہ کے لئے بلا لحاظ مذہب و ملت کھلے رکھنے چاہیں تاکہ غیر مسلموں میں بھی جسے اس تحریک کا ساتھ دینے کی توفیق ہو، وہ کسی رکاوٹ کے بغیر ایسا کرے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہندو فرقہ پرست پریس اور جماعتوں کو تحریک پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی''۔ (شیخ محمد عبداللہ ''آتش چنار'' صفحہ 228)

مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس 25، 26، 27 مارچ 1938ء کو جموں کے مقام پر شیخ محمد عبداللہ کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ ریاست کے طول و عرض سے بہت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ یہ اجلاس شان و شوکت اور انتظامات کے اعتبار سے بے مثال تھا۔ شیخ محمد امین ممبر قانون ساز اسمبلی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ذمہ دار نظام حکومت کے مطالبے کو ہر مقرر نے دہرایا اور عزم کیا کہ ریاست کے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، بدھ اور ہریجن سب مل کر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں گے۔ شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی حالات پر سیر حاصل بحث کی اور مسلم کانفرنس کا نقطہ نظر پیش کیا۔ اُنہوں نے ذمہ دار نظام حکومت کی بھی وضاحت کی اور اس جدوجہد میں غیر مسلموں کو بھی شمولیت کی دعوت دی۔ اُنہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا'' ہم آزادی کی جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ مسلم اور غیر مسلم کی جنگ نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ اس لئے سارے مظلوم اکٹھے ہو جائیں''۔ شیخ صاحب کے مفصل خطاب کا خلاصہ جسٹس یوسف صراف نے یوں بیان کیا ہے:

"It is essential that all those people who suffer from the present system of government should get an opportunity to join in the struggle for the achievement of responsible Government. Who are these people? They are not only Muslims but also Hindus and Sikhs, untouchables and Budhists, nay, all citizens of the State. Some Muslims have misconception that all non-Muslims are living a life of comfort. This is not correct. Only a few thousand among them stand protected against inequalities and disabilities otherwise the rest of them are like you, poor, indebted, illiterate and suffer from other excesses. The demand for responsible Government is not meant for eighty percent Muslims alone but for all Inhabitants of the State; therefore it is necessary to march together with the twenty percent non-Muslims.

The main problem now before us, therefore, is to initiate joint action and form a united front against the forces that stand in the way of the achievement of our goal. This will require renaming of our

organization as a non-communal political party, necessitating amendments in its constitution.

I reiterate today what I have said so often: firstly, we must end communalism, by ceasing to think in terms of Muslims and non-Muslims when discussing our political problems. Secondly there must be universal suffrage on the basis joint electorate. Without these two, democracy is lifeless.

You complain that Hindus belonging to the vested interests are reactionary and stand in the way of our progress. But have we not had the same experience in the case of capitalist Muslims also? It is significant as well as hopeful that despite many difficulties, some non-Muslims have cooperated with us though their number is very small. Their sincerity a nd moral courage make us feel their strength. We must therefore open our doors to all such Hindus and Sikhs who, like ourselves, believe in freeing the country from the shackles of an irresponsible rule".

(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل صفحہ 524, 523)

اس اجلاس میں قراردادیں بھی پیش کی گئیں۔ ایک قرارداد مولوی محمد سعید مسعودی نے پیش کی جس کا مقصد یہ تھا، مسلم کانفرنس کا نام تبدیل کر کے اس کا نام "آل جموں و کشمیر پولیٹیکل کانفرنس" رکھا جائے تا کہ ریاست کے غیر مسلم باشندے بھی اس میں شامل ہو سکیں"۔ اس قرارداد کی تائید راجہ محمد اکبر خان آف میرپور نے کی، جبکہ اے آر ساغر، شیخ محمد امین اور عبدالمجید قریشی نے اس کی مخالفت کی۔ بحث و تمحیص کے بعد کثرتِ رائے سے یہ قرارداد اس شرط پر منظور کی گئی کہ تبدیلی نام کے مسئلہ پر آئندہ مجلس عامہ کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا جائے اور اس دوران عوامی رائے عامہ کا جائزہ لیا جائے۔

اپریل 1938ء میں جموں کے مسٹر ایس اے شیخ کی انفرادی کوششوں سے نیشنل کانفرنس کے نام سے ایک تنظیم کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ مئی میں ایک اور جماعت نیشنل کانگریس کے نام سے سرینگر میں قائم کی گئی جس کے صدر خواجہ محمد عمر بٹ تھے جبکہ سیکرٹری جنرل پنڈت رگوناتھ وشنوی تھے۔ اس جماعت کے دیگر بانی ممبروں میں مسٹر ویر پرکاش، سیٹھ کشوری لعل اور خواجہ علی محمد بٹ آف بسنت باغ شامل تھے۔

مذکورہ بالا دونوں جماعتیں انتہائی محدود سطح پر نمودار ہوئیں اور نہ ہی یہ کوئی نمایاں خدمات سرانجام دے سکیں۔ البتہ اُنہوں نے ریاستی سیاست میں متحدہ قومیت کے تصور کو تقویت دی اور یہ جماعتیں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعدازاں جب نیشنل کانفرنس معرضِ عمل میں آئی تو یہ دونوں جماعتیں اس میں مدغم ہو گئیں۔

24 جون سے 28 جون 1938ء کو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس سرینگر میں اس مقصد کے لئے منعقد ہوا تا کہ مسلم کانفرنس کا نام تبدیل کرنے کے معاملے پر غور و خوض کیا جا سکے۔ یہ اجلاس پانچ روز جاری رہا، 52 گھنٹے بحث و تمحیص پر صرف ہوئے۔ بالآخر 28 جون کو یہ قرارداد منظور کی گئی۔

"ہر گاہ کہ ورکنگ کمیٹی کی رائے میں وقت آن پہنچا ہے کہ ملک کے تمام ترقی پسند عناصر ذمہ دار نظام حکومت کے حصول کے لئے ایک جھنڈے تلے جمع کیے جائیں۔ اس لئے مجلسِ عامہ جنرل کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ آئندہ ہونے والے سالانہ اجلاس کے موقع پر کانفرنس کے نام اور آئین میں اس قسم کی تبدیلی اور ترمیم کی جائے کہ تمام ایسے لوگ جو اس سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی خواہش رکھتے ہوں، بلاتمیز مذہب و ملت اور رنگ و نسل آسانی کے ساتھ اس کانفرنس کے رکن بن سکیں"۔

اس قرارداد کی مخالفت میں چوہدری غلام عباس، شیخ احمد دین بانہال اور مسٹر عبدالمجید قریشی پیش پیش تھے۔ اس لئے اُنہیں جماعت سے مستعفی ہونے کو کہا گیا۔

اسی اثناء میں کشمیر اسمبلی کے دوسرے انتخابات 31 مئی 1938ء کو ہوئے۔ اگرچہ جماعت کا نام اور منشور تبدیل کرنے کے مسئلے پر جماعتی صفوں میں خاصا انتشار اور نا اتفاقی پیدا ہو چکی تھی، لیکن کارکنوں کی محنت اور اخلاص کے بل بوتے پر مسلم کانفرنس نے 21 میں سے 19 سیٹوں پر کامیابی حاصل کر لی۔ وزیراعظم گوپال سوامی آئینگر جو کٹر مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والا ہندو تھا، اُس کے لئے یہ صورتحال خاصی پریشان کن تھی، چونکہ مسلم کانفرنس نے یہ انتخابی معرکہ "ذمہ دار نظامِ حکومت" کے مطالبہ پر سر کیا تھا، اس لئے انتخابات میں کامیابی کے فوراً بعد مسلم کانفرنس کی قیادت نے اپنے منشور پر عملدرآمد کے لئے جدوجہد تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ وزیراعظم سمجھتا تھا کہ ذمہ دار نظامِ حکومت کا مطالبہ کسی بھی طرح حکومتی مشینری کے لئے قابلِ قبول نہیں ہے، اس لئے اس نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو کچلنے کے لئے تدبیریں بنانے لگا۔ ادھر مسلم کانفرنس نے 5 اگست 1938ء کو "یومِ ذمہ دار نظامِ حکومت" منانے کا اعلان کر دیا۔ غیر مسلموں نے بھی اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور مسلمانوں کے شانہ بشانہ اُنہوں نے بھی یہ دن جوش و خروش سے منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم کانفرنس کی کال پر لبیک کہتے ہوئے ہندوؤں اور پنڈتوں نے بھی شرکت، 5 تاریخ کو سرینگر میں ذمہ دار نظامِ حکومت کا نعرہ لگایا اور ایک مشترکہ احتجاجی جلوس نکالا جو خلوص، دیانتداری، حب الوطنی اور قوم پرستی کا عظیم الشان مظاہرہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی "ذمہ دار نظامِ حکومت" کی خاطر چلائی جانے والی یہ تحریک ساری ریاست میں پھیل گئی۔ مسلموں اور غیر مسلموں نے ہر جگہ مشترکہ احتجاجی پروگرام منعقد کیے۔ اس صورتحال سے حکومت بوکھلا اُٹھی اور اس نے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ 29 اگست 1938ء کو ریاست کے ہندو، مسلم اور سکھ راہنماؤں نے ایک مشترکہ منشور "National Demand" کے نام سے جاری کیا۔ اس منشور پر 12 راہنماؤں کے دستخط تھے، جن میں شیخ عبداللہ، مولوی محمد سعید مسعودی، مرزا افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق، میاں احمد یار خان،

پنڈت کشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز، سردار بدھ سنگھ، پنڈت جیالعل کلم، بخشی غلام محمد، پنڈت شام لال صراف، ڈاکٹر شمبھو ناتھ شامل تھے۔ اس قومی مطالبے میں والئی ریاست کے زیر سایہ ایک ذمہ دار نظامِ حکومت قائم کرنے کا مطالبہ شامل تھا اور بلاتمیز مذہب وملت سب نمائندوں نے مشترکہ جدوجہد کا عزم کیا تھا۔ حکومت نے قومی منشور پر دستخط کرنیوالے تمام مسلم وغیر مسلم راہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ممبرانِ اسمبلی کو اسمبلی کی رکنیت سے برطرف کر دیا گیا اور پانچ سال تک ان پر انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس تحریک میں مجموعی طور پر ایک ہزار افراد گرفتار ہوئے جن میں 60 غیر مسلم بھی تھے۔

مسلم وغیر مسلم راہنماؤں کی ان گرفتاریوں نے حکومت کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا کیونکہ اب غیر مسلم شانہ بشانہ ان گرفتاریوں کیخلاف ریاست بھر میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں شریک ہونے لگے اور اس سے تحریکِ حریت ایک نئے مرحلے میں داخل ہونے لگی۔ چنانچہ اس صورتحال کو حکومت زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی اور اُس نے فروری 1939ء میں تمام راہنماؤں کو رہا کر دیا۔

نیشنل کانفرنس کا قیام

چھ ماہ تک قید کی سزا کاٹنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ 28 فروری 1939ء کو مظفر آباد جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ سرینگر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کا مشترکہ استقبال کیا۔ شیخ عبداللہ نے اپنے خطاب میں مسلم لیگ کی پالیسیوں پر تنقید کی اور کانگریس کی حمایت کا عندیہ ظاہر کیا۔ قید کے اس عرصے میں شیخ محمد عبداللہ متحدہ قومیت کے نظریے کے زبردست داعی بن کر سامنے آئے اور وہ مسلم کانفرنس کو اس نظریے کی راہ پر لانے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہنے لگے۔ مارچ 1939ء میں اُنہوں نے اپنے ساتھیوں مولوی محمد سعید مسعودی، پنڈت کشپ بندھو اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ہمراہ تریپورہ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔

ہندوستان سے واپس آ کر شیخ عبداللہ نے ریاست گیر رابطے شروع کیے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لئے جون 1938ء کے ریزولیشن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس 10، 11 جون 1939ء کو پتھر مسجد سرینگر میں بلایا جائے۔ خواجہ غلام محمد صادق کی سربراہی میں ایک سب کمیٹی بھی تشکیل دی گئی، جس نے مسلم کانفرنس کے دستورِ اساسی میں ترامیم پیش کرنا تھیں۔ چنانچہ 10 جون کو پتھر مسجد سرینگر میں مسلم کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس خواجہ غلام محمد صادق کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ریاست بھر سے مسلم کانفرنس کے اہم عہدیداروں اور کارکنوں نے شرکت کی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر مولانا محمد سعید مسعودی نے 28 جون 1938ء کا ریزولیشن اجلاس کی عام بحث کے لئے پیش کیا۔ جس پر مندوبین نے کھل کر بحث کی۔ بالآخر مولانا سعید مسعودی نے ایک قرارداد پیش کی جس کا خلاصہ یہ ہے:

"مسلم کانفرنس کا یہ خصوصی اجلاس ورکنگ کمیٹی کے 28 جون 1938ء کے ریزولیشن کی منظوری دیتا ہے، جس کی رو سے آئندہ جماعت کا نام آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس ہوگا اور ریاست جموں کشمیر کا ہر بالغ انسان مرد ہو یا عورت بلاتمیز مذہب وملت ورنگ ونسل اس کانفرنس کا ممبر بن سکے گا بشرطیکہ وہ شخصی آزادی کے حصول اور ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام کے لئے جماعتی پالیسی کی تائید واقرار کرے۔ مسلم کانفرنس کے تمام عہدیداروں و کارکنان اب نیشنل کانفرنس کے عہدیدار و کارکن تصور ہوں گے"۔

(تفصیل جاننے کے لئے دیکھئے جسٹس محمد یوسف صراف کی تصنیف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل صفحہ 528)

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے لکھا ہے کہ جب یہ قرارداد پیش ہوئی تو 176 ممبران میں سے صرف تین آدمیوں نے مخالفت میں ہاتھ کھڑے کیے، جبکہ "تحریکِ حریت کشمیر" کے مصنف رشید تاثیر کا بیان ہے کہ اس قرارداد کے خلاف احمد دین بانہالی، مولوی محمد عبداللہ ایڈووکیٹ اور خواجہ غلام احمد گنائی آف بھدرواہ نے اجلاس سے واک آؤٹ کیا، جبکہ ایک اور مؤرخِ کشمیر جسٹس محمد یوسف صراف کا بیان ہے کہ "چوہدری حمید اللہ خان، مولوی رفیع الدین، مسٹر غلام حیدر غوری، مولوی محمد عبداللہ ایڈووکیٹ، شیخ احمد دین بانہالی اور خواجہ غلام احمد گنائی آف بھدرواہ نے اس کی شدید مخالفت کی۔

مذکورہ بالا قائدین وممبران نے اس تبدیلی کی سختی سے مخالفت کی۔ علاوہ ازیں کچھ قائدین وممبران الگ تحفظات بھی رکھتے تھے۔ ان ممبران کی ترجمانی چوہدری غلام عباس کر رہے تھے چنانچہ ان خدشات پر تبادلہ خیال کے لئے چوہدری غلام عباس، شیخ محمد عبداللہ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے علیحدہ ایک میٹنگ کی جس میں خدشات وتحفظات پر سیر حاصل بحث ہوئی اور طے پایا کہ نیشنل کانفرنس کو آل انڈیا نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست سے الگ رکھا جائے گا، نیز مسلمانوں کے مخصوص مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کی جدوجہد سے انحراف نہیں کیا جائے گا۔

اس میٹنگ سے چوہدری غلام عباس اور دوسرے معترضین کے خدشات دور ہو گئے تو انہوں نے قرارداد کی حمایت کی۔

چوہدری غلام عباس نے قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

"1931ء میں ریاست جموں کشمیر کی سیاست نوزائیدہ اور عالمِ طفولیت میں تھی۔ اس وقت کی سیاست کے لئے جو لباس تجویز کیا گیا تھا آج کی جوان سیاست کے لئے وہ تنگ ہو چکا ہے۔ آج یہاں ضروریات بڑھ رہی ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسیات کے موجودہ جسم کے مطابق لباس کا مناسب انتظام کیا جائے۔ اس کانفرنس میں وسعت پیدا کی جائے۔ اب غیر ذمہ دار نظامِ حکومت کو ختم کرنے کے لئے سب فرقوں کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ جہاں مسلمان مظلوم ہیں، وہاں غیر مسلم بھی مظلوم ہیں۔ اس لئے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی اپنی جدوجہد میں شامل کرنا اسی مقصد کے تابع ہے....... آٹھ سال پہلے جو سیاسی قبا ہم نے پہنی تھی وہ صرف پرانی ہی نہیں بلکہ تار تار ہو چکی ہے۔ اب ہمیں ایسا جامہ پہننا چاہیے جو ہمارے لئے باعث عزت اور دنیا کے لئے باعثِ فخر ہو۔ اس لئے میں اس ریزولیشن کی تائید کرتا ہوں"۔

(ڈاکٹر سلام الدین نیاز "ان کہی داستانِ کشمیر" صفحہ 86-785)

اے آر ساغر نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"میرا خیال ہے کہ تجویز کو صرف مذہبی لحاظ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ جس طرح ہم سکولوں، کالجوں، کھیتوں اور بازاروں میں کام انجام دیتے وقت نہیں دیکھتے کہ ہمارے دوش بدوش صرف مسلمان ہیں یا کوئی اور۔ اس طرح ہمیں سیاسیات میں حصہ لیتے وقت بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔۔۔۔۔۔ متحدہ قومیت وقت کی پکار ہے، جس نے اسے نہ سنا اسے مستقبل میں پچھتانا پڑے گا۔"
(کلیم اختر "شیرِ کشمیر" صفحہ 241)

پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی اس اجلاس میں موجود تھے اُنہوں نے اس تبدیلی کو تحریک آزادی کشمیر کامرانی اور مسرت کا دن (Red Letter Day) قرار دیا ہے۔ اُنہوں نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"I have never been so happy as I am today ; it is overwhelming that it is not possible for me to express myself coherently and with ease. From the very beginning, it has been my longing to bring all the communities on a common platform.Whenever I expressed these views to my friends, they used to laugh at me but Sheikh Mohammad Abdullah used to say that unity will be achieved, though, progressively and slowly. The Pandits used to say that they had expelled me from their community and that I why I talked of things which were detrimental to them while the Muslims used to say that in reality, Bazaz was a C.I.D. planted by the Kashmiri Pandits who wants to damage Muslims interests but God alone knew the secret of my heart": مگر میرے دل کا بھید خدا ہی جانتا ہے
(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل صفحہ 534)

10 جون کو قرارداد پیش ہوئی تو اس کی تائید وحمایت اور مخالفت میں رات گئے تک بحث جاری رہی۔ بہت سے شرکاء نے اس بحث میں حصہ لیا۔ قرارداد کی مخالفت کرنے والوں میں چوہدری حمید اللہ خان پیش پیش تھے۔ انہوں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

"آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے دستورِ اساسی میں یہ شرط ہے کہ اس کانفرنس کے اہم مقاصد اتحاد بین المسلمین، مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، مذہبی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ وترقی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس قرارداد کے منظور ہونے کی صورت میں مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور تمدن زندگی پر کیا اثر پڑے گا، کیا مسلمانوں کی بدحالی دور ہوگئی ہے کہ نیشنل کانفرنس بنادی گئی ہے یا صرف حصول ذمہ دار نظامِ حکومت کی طرف ہی زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے"۔
(ڈاکٹر سلام الدین نیاز "ان کہی داستانِ کشمیر" صفحہ 487)

اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد چوہدری حمید اللہ خان بھی قرارداد کی تائید کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔ 11 جون کے اوپن سیشن میں بہت سے غیر مسلم مندوبین بھی شریک ہوئے۔ کشمیری پنڈتوں کے ایک سرکردہ لیڈر پنڈت جیا لعل کلم نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

"ہم بیرونِ ریاست کی ایسی تنظیم سے مدد لے سکتے ہیں، جس کی امداد بے غرض ہو، البتہ ہم اگر مدد لیں گے تو مسلم لیگ یا ہندو سبھا سے نہیں لیں گے کیونکہ اوّل الذکر انجمن کہتی ہے کہ مادرِ وطن ہندوستان کو تقسیم کر دو، جبکہ مؤخر الذکر تنظیم کہتی ہے، ہندوستان میں ہندو راج قائم کرو۔ ہاں اگر احرار اور جمعیت العلماء جیسی تنظیمیں ہماری مدد کریں تو ہم اُسے قبول کریں گے"۔

نیشنل کانفرنس کا دستورِ اساسی

مسلم کانفرنس کے دستورِ اساسی میں ضروری ترمیمات پیش کرنے کے لئے جو سب کمیٹی اپریل میں تشکیل دی گئی تھی اس نے 11 جون کے روز اپنا ترمیم کردہ مسودہ آئین "آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس" دفعہ 1 تا 18 بحث کے لئے جنرل کونسل کے سامنے پیش کیا۔ دن 1 بجے سے 5 بجے تک اس پر بحث ومباحثہ جاری رہا۔ بالآخر متعدد ترمیمات و دفعہ 19 کے اضافے کے ساتھ مسودہ آئین منظور کر لیا گیا۔ آئین کی دفعہ اوّل میں کانفرنس کے اغراض ومقاصد ایک فقرے میں یوں بیان کیے گئے۔

"آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کا مقصد حصولِ ذمہ دار نظامِ حکومت بذریعہ مناسب جدوجہد و پرامن مساعی ہے"۔
(مرزا شفیق حسین "کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد" منتخب دستاویزات صفحہ 489)

(نوٹ: نیشنل کانفرنس کا مفصل آئینِ اساسی مرزا شفیق حسین کی مذکورہ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔)

مسودہ آئین کی منظوری کے بعد اس اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی گئی، جس میں غیر مسلموں کو بھی جنرل کونسل اور ورکنگ کمیٹی میں شامل کرنے کی تحریک کی گئی، چنانچہ اس روز ورکنگ کمیٹی میں سردار بدھ سنگھ، پنڈت جیا لعل کلم، گردھاری لال آگرہ، پنڈت کشپ بندھو اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کو مجلسِ عاملہ کا ممبر نامزد کیا گیا۔

O

9

مُسلم کانفرنس کا احیاء

پسِ منظر
اسباب
واقعات
محرکات
احیاء کی کوششیں
تشکیلِ نو

پسِ منظر:

مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کے فیصلے سے ریاست کے سو فیصد مسلمان متفق نہیں تھے۔ 11 جون 1939ء کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کے جس اجلاس میں یہ تبدیلی عمل میں لائی گئی اُس میں اس فیصلے سے اختلاف رکھنے والے مخلص اور بیباک ممبران نے کھل کر مخالفت کی اور اُنہوں نے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ صفِ اول کے راہنما جو سیاسی بصیرت سے عاری تھے اور جنکے گرد مفاد پرستی اور شہرت پسندی کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا، یہ اجلاس اُنکی خواہشات کی تکمیل کیلئے بلایا گیا تھا۔ لیکن دینی وملی غیرت کے جذبے سے سرشار اور دین وسیاست کو مربوط رکھنے کی سوچ کے حامل مسلمانانِ ریاست کو ان راہنماؤں کے فیصلے سے سخت مایوسی ہوئی۔ یہ مخلص اور ایثار پیشہ لوگ مسلم کانفرنس سے بے پناہ اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ وہ اس جماعت کو مسلمانانِ ریاست کی نمائندہ آواز سمجھتے تھے۔ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ یہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے۔

مسلم کانفرنس کی خاطر ریاستی مسلمانوں نے اپنی جان ومال کی بے پناہ قربانیاں پیش کی تھیں اور یہ ان کی قربانیوں کا ثمر تھا کہ مسلم کانفرنس سیاسیاتِ کشمیر میں ایک مضبوط اور نمائندہ جماعت بن کر سامنے آئی۔ ان قربانیوں کو رائیگاں جاتا دیکھ کر مخلص اور ایثار پیشہ کارکنوں کو سخت دکھ پہنچا۔ کچھ پڑھے لکھے اور باہمت کارکن جنہوں نے اس کی حیات کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی تھی وہ اپنی اس متاعِ عزیز کو پھر سے بازیاب کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلتے وقت چونکہ جماعت میں صفِ اوّل کے سب قائدین اس عمل میں شریک تھے۔ صوبہ جموں یا وادی میں کوئی بھی ایسا لیڈر موجود نہیں تھا جو جماعت کا نام یا منشور بدلنے کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکتا یا اس موقع پر مسلم کانفرنس کا علیحدہ وجود قائم رکھنے کا اعلان کر پاتا۔ اس لئے مسلم کانفرنس کو ازسرِ نو بحال کرنے کے سلسلے میں ان میں سے کسی لیڈر نے کوئی کردار ادا نہ کیا۔ ان حالات میں ضلع اننت ناگ سے تعلق رکھنے والے کچھ مخلص سیاسی کارکن مسلم کانفرنس کو حیاتِ نو عطا کرنے کا عزم لے کر اُٹھے۔ یہ وہی کارکن تھے، جنہوں نے 11 جون کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جلسے سے واک آؤٹ کر گئے تھے۔ لیکن ان کارکنوں کی مجبوری یہ تھی کہ ضلع اننت ناگ میں ان کی راہنمائی کرنے والا کوئی نمایاں لیڈر موجود نہیں تھا۔ مرزا افضل بیگ اسی ضلع سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ دل وجان سے نیشنل کانفرنس کو قبول کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کارکنوں نے سری نگر میں اپنے ہم خیال کارکنوں سے رابطہ کیا اور قریشی محمد یوسف کی راہنمائی میں اُنہوں نے اعلان کیا کہ وہ مسلم کانفرنس کو دوبارہ بحال کریں گے۔ یہ اعلان مسلم کانفرنس کی حیاتِ نو کے سفر میں پہلا سنگِ میل ثابت ہوا۔ سرینگر اور وادی کے دوسرے اضلاع میں یہ کارکن متحرک ہو گئے۔ چنانچہ 15 ستمبر 1939ء کو اُنہوں نے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا اور ریاستی مسلمانوں کو مسلم کانفرنس کی بحالی کیلئے تیار رہنے کا پیغام دیا۔ اس جلوس کے شرکاء نے نیشنل کانفرنس کے ہیڈکوارٹر مجاہد منزل پر قبضے کی کوشش کی۔ جامع مسجد کے احاطے میں واقع یہ دفتر مسلم کانفرنس کا ہیڈکوارٹر رہ چکا تھا اور یہ مسلمانوں کے چندے سے تعمیر ہوا تھا۔ قبضے کی کوشش میں مظاہرین اور نیشنل کانفرنسی کارکنوں کے مابین شدید تصادم ہوا، جس کے نتیجے میں قریشی محمد یوسف سمیت کئی لوگ شدید زخمی ہو گئے۔ اس تصادم میں پولیس کے کارکن بھی زخمی ہوئے۔ نیشنل کانفرنس کے راہنما [illegible] نے خود اس آپریشن کی قیادت کی۔ اگرچہ قریشی محمد یوسف اور ان کے ساتھیوں کی مجاہد منزل پر قبضہ کرنیکی کوشش کامیاب نہ ہو سکی، لیکن یہاں سے سیاسیاتِ کشمیر پھر ایک نئے موڑ میں داخل ہوئی۔ انہی ماہ وسال میں بین الاقوامی سطح پر اور اندرونِ ریاست کچھ ایسے حالات وواقعات پیش آئے جو مسلم کانفرنس کے احیاء کا پیش خیمہ بنے۔

مسلم کانفرنس کے احیاء کا محرک بننے والے کچھ نمایاں واقعات حسبِ ذیل ہیں:

دوسری جنگِ عظیم کا آغاز:

3 ستمبر 1939ء کو دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ نے سامراجی قبضے میں پھنسی ہوئی محکوم قوموں میں بیداری اور قومی آزادی کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انگریز کی اسلام دشمنی اور اس کے سامراجی عزائم کے پیشِ نظر مسلم امت اسے اپنا ازلی دشمن سمجھتی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں جرمن اور جاپان کیساتھ تھیں، کیونکہ وہ بھی انگریز سے چھٹکارا حاصل کرنیکی جدوجہد کر رہے تھے۔ وائسرائے ہند نے ہندوستانی عوام سے اپیل کی کہ وہ اس جنگ میں یورپ اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس موقع پر مطالبہ کیا کہ برطانیہ اگر جنگ جیت جائے تو وہ ہندوستان کا اقتدارِ اعلیٰ ہندوستانی عوام کے سپرد کر دے۔ کانگریس کے اس مطالبے کی حمایت آل

جموں کشمیر نیشنل کانفرنس نے بھی کی۔ ادھر مہاراجہ کشمیر نے انگریز کی حمایت کا نہ صرف اعلان کیا بلکہ 20 ہزار [illegible] انگریز کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے بھیج دیئے۔ جب کشمیری نوجوان اس جنگ کا ایندھن بننے لگے تو گھر گھر [illegible] بچھ گئی اور مائیں، بہنیں اور بیویاں پکار اُٹھیں۔

وچ بھرے لگی لڑائی، کھر کھر آئیاں تاراں
کوئیاں دیاں رودن ماتواں بہناں تے کوئیاں دیاں ناراں (پہاڑی)

اس سے ریاستی مسلمانوں کے جذبات بھڑک اُٹھے اور وہ اپنی بقاء اور سلامتی کے لئے متفکر ہوئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں کشمیری نمائندوں کی شرکت

23 مارچ 1940ء کو منٹو پارک لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا، جس میں قرارداد پاکستان [illegible] گئی۔ اس اجلاس میں کشمیری مسلمانوں کے ایک وفد نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ [illegible] بھی ہوا، جس میں نواب بہادر یار جنگ کو سٹیٹس مسلم لیگ کا تاحیات صدر نامزد کیا گیا۔ اس اجلاس میں [illegible] اے حفیظ، ایم اے عزیز، محمد اسمٰعیل ساغر، پیر ضیاء الدین اندرابی، محمد اسحٰق قریشی، سید حسن شاہ گردیزی، شیخ [illegible] سردار فتح محمد خان کریلوی، منشی گل احمد خان اور مولوی غلام حیدر جنڈالوی نے شرکت کی۔ جنڈالوی صاحب [illegible] اجلاس میں تقریر بھی کی۔ پروفیسر ایم اے عزیز کو سٹیٹس مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا ممبر بھی چنا گیا۔

مسلم لیگ کے راہنماؤں نے کشمیری زعماء سے افسوس کا اظہار کیا کہ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس [illegible] دیا گیا ہے۔ اُنہوں نے وفد کے ممبران کو کشمیر میں مسلم لیگ کا پیغام عام کرنے اور ریاستی مسلمانوں کی ایک [illegible] از سرِ نو قائم کرنیکا مشورہ دیا اور انہیں مسلم لیگ کی حمایت کا یقین دلایا۔ لاہور سے واپس لوٹتے ہی ان [illegible] مسلمانوں کیلئے نئی سیاسی جماعت بنانے کے بجائے مسلم کانفرنس کو ہی از سرِ نو بحال کرنے کیلئے کوششیں تیز کر دیں۔

مسلم سٹوڈنٹس یونین کا قیام

1940ء میں ایس پی کالج سرینگر کے مسلمان طلباء نے ''مسلم سٹوڈنٹس یونین'' کے نام سے ریاست [illegible] مسلمان طلباء کی ایک نمائندہ تنظیم کا قیام عمل میں لایا۔ اس تنظیم کے صدر احمد اللہ رعنا اور سیکرٹری جنرل [illegible] تھے۔ جبکہ ان کے دیگر رفقاء میں میر عبدالعزیز، خواجہ حبیب اللہ لگرو، راجہ محمد اکرم (مظفر آباد)، احمد شبیر جناتی، [illegible] لیتین اور خواجہ غلام نبی بٹ نمایاں تھے۔ جب مسلم سٹوڈنٹس یونین کا قیام عمل میں آیا، اس وقت ریاستی طلباء [illegible] نمائندہ تنظیم قائم نہیں تھی۔ اس یونین نے ریاستی طلباء میں سیاسی بیداری پیدا کی۔

کے ایچ خورشید اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

''میں نے اور میرے کشمیری رفقاء نے مسلم سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی جو برصغیر میں انگریزی سامراج کیخلاف اور قیامِ پاکستان کی حمایت میں سرگرم عمل تھی''۔ (محمد سعید اسعد ''کشمیر قائداعظم اور کے ایچ خورشید'' صفحہ 258)

[illegible] سٹوڈنٹس یونین کشمیری طلباء کی پہلی سیاسی تنظیم تھی۔ اس یونین نے سیاسیاتِ کشمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

''[illegible] نوجوانوں کی اس تنظیم نے خاطر خواہ کام کیا۔ اُنہوں نے لوگوں کے ذہن بیدار کیے اور کشمیری مسلمانوں کو احساس ہوا [illegible] کی فلاح اس میں ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت کا قیام عمل میں لائیں، جو مسلمانوں کی صحیح ترجمان ہو۔ مسلم [illegible] سٹوڈنٹس یونین نے سرینگر میں ایسے اجتماعات کیے، جن میں قائداعظم کی قیادت پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہونے کے عزم کا اعلان کیا''۔

(چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ ''جموں کشمیر کی جنگ آزادی کی کہانی تاریخ کی زبانی'' صفحہ 129)

جموں کشمیر مُسلم لیگ کا قیام

ریاست جموں کشمیر میں مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم کے خاتمے کے بعد علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر [illegible] مسلمان طلباء نے جموں اور سرینگر میں ''آل جموں کشمیر مُسلم لیگ'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ اس جماعت نے سرینگر اور جموں میں جلسوں کا اہتمام کیا۔ سرینگر میں مسلم لیگ کے صدر ایم اے عزیز (پروفیسر) اور سیکرٹری جنرل ایم اے حفیظ منتخب ہوئے۔ وادی میں مسلم لیگ کے دیگر سرگرم کارکنوں میں پیر ضیاء الدین اندرابی، محمد [illegible] صابر، میر عبدالعزیز، آغا عاشق حسین، مرزا غلام محی الدین، محمد اسمٰعیل ساغر، عبدالسلام دلال، محمد اقبال بلتی اور احمد [illegible] شامل تھے۔

مسلم لیگ کی جموں شاخ کے صدر سید غلام حیدر شاہ اور سیکرٹری جنرل محمد اسحٰق قریشی (پروفیسر) تھے۔ ان کے ہمراہ شیخ عبدالرحمٰن، حافظ کرم الٰہی اور پرنس آف ویلز کالج جموں کے پروفیسر عبدالرشید سرگرم عمل تھے۔ ان [illegible] نے کشمیر میں نیشنل کانفرنس کا اثر زائل کرنے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا پیغام ریاست جموں کشمیر میں پھیلانے کے لئے دن رات کام کیا۔ مسلم لیگ سے وابستہ نوجوان پڑھے لکھے تھے۔ اُنہوں نے تھوڑا عرصہ متحرک رہنے کے بعد [illegible] اختیار کر لیں۔ اس لئے مسلم لیگ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ لیکن ان نوجوانوں کی کوششوں کا یہ فائدہ ہوا کہ ریاست میں مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کی ضرورت و اہمیت کا احساس اُبھر کر سامنے آیا۔ اس سے مسلم کانفرنس کے احیاء کی کوششوں کو تقویت ملی۔

پنڈت نہرو کا دورۂ کشمیر

نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ جن کا جھکاؤ واضح طور پر انڈین نیشنل کانگریس کی طرف ہو چکا تھا، انہوں نے پنڈت نہرو کو کشمیر کے دورے کی دعوت دی، کیونکہ نہرو گذشتہ 20 برس سے کشمیر نہیں آئے تھے۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد چونکہ مسلم لیگ اب کشمیر کی اندرونی سیاست کی طرف متوجہ ہو رہی تھی اور ریاست میں مسلم لیگ کی حمایت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لئے نہرو بھی کشمیر آنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ نیشنل کانفرنس نے نہرو کے دورے کا اعلان کیا اور ان کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل کے مسئلے پر کانفرنس کے راہنماؤں میں

تلخ کلامی ہوگئی، جس کے نتیجے میں پنڈت کشپ بندھو اور پنڈت جیا لعل کلم نے نیشنل کانفرنس پر فرقہ واریت کا الزام لگاتے ہوئے اس کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز اُنکے مستعفی ہونے کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

"Though there is no doubt that they acted hastily, it is unfair to judge them by the isolated action. They were forced to take this step by the oppressive communal atmosphere which was daily increasing inside the circles of the conference." (پنڈت پریم ناتھ بزاز "Inside Kashmir" صفحہ 327)

شیخ عبداللہ کی سربراہی میں استقبالیہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کو مسلمانوں نے پنڈت نہرو کے استقبال کی خاطر چندہ دینے سے انکار کردیا۔ البتہ پنڈتوں نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا۔ پنڈت جی کی آمد سے ایک روز قبل 29 مئی کو جموں کشمیر مسلم لیگ کے زیر اہتمام سرینگر میں ایک جلسۂ عام کا انعقاد کیا گیا، جس میں مسلم لیگ کے مطالبے پر اظہار یکجہتی کیا گیا اور لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ پنڈت نہرو کے دورے سے لاتعلق رہیں۔ پنڈت نہرو خان عبدالغفار خان کے ہمراہ 30 مئی 1940ء کو سرینگر پہنچے۔ یہ ان کا دوسرا دورۂ کشمیر تھا۔ نیشنل کانفرنس نے ان کا بھرپور استقبال کیا۔ یہ استقبال جھیل ڈل کی لہروں پر کشتیوں کے ذریعے کیا گیا۔ میر واعظ مولانا یوسف شاہ کے حامیوں نے اور مسلم لیگ کے کارکنوں نے جھیل کے کنارے جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے کیے اور "نہرو واپس جاؤ"، "مسلم لیگ زندہ باد"، "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ پنڈت نہرو جب امیرا کدل سے گزرے تو وہاں مسلم لیگ کے حامیوں نے ان کیخلاف خوب نعرہ بازی کی۔ یہاں پنڈت نہرو حادثے سے بال بال بچ گئے کیونکہ نہرو کے گزرنے کے چند لمحے بعد یہاں بنایا گیا ایک استقبالی دروازہ گر گیا۔

31 مئی کو پنڈت نہرو نے حضوری باغ میں نیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اسی روز جموں کشمیر مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک ہینڈ بل بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا، جس کا عنوان تھا "کیا پنڈت جی وضاحت کریں گے"۔

اس اشتہار میں پنڈت نہرو سے بہت سے سوالات پوچھے گئے تھے جن کا خلاصہ یہ ہے:

☆ آپ نے لدھیانہ میں بیان دیا تھا کہ آپ کشمیری ہیں، مگر 1931ء میں آپ کہاں تھے جب مسلمان اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔

☆ مسلمانوں نے 1931ء سے 1938ء تک اپنے حقوق کے لئے کئی تحریکیں چلائیں اس عرصے میں آپ کی ہمدردیاں کہاں گئیں؟

☆ آپ کے کانگریسی ساتھیوں نے 1931ء کی تحریک آزادی کی مخالفت کیوں کی تھی؟

☆ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ صرف مسلم لیگ کے اثر ورسوخ کو روکنے کے لئے کشمیر آئے ہیں؟

(اس ہینڈ بل کا مکمل ٹیکسٹ یوسف صراف کی تصنیف "Kashmiri's Fight for Freedom" کے صفحہ 544 پر ملاحظہ کریں)

اس ہینڈ بل کی ایک کاپی جلسہ عام میں پنڈت نہرو تک پہنچائی گئی، لیکن پنڈت نہرو نے اُسے پڑھ کر جواب دینے کے بجائے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ پنڈت نہرو نے اس دس روزہ دورے کے دوران مختلف تقریبات میں شرکت کی اور انہوں نے ہندوؤں کو نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے اور شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ مضبوط کرنے کی ہدایت کی لیکن پنڈتوں نے نہرو کی اس ہدایت پر کوئی عمل نہ کیا۔ اس سے شیخ عبداللہ کو بھی سخت مایوسی ہوئی۔

پنڈت نہرو جموں کے راستے واپس گئے۔ جموں پہنچ کر انہوں نے چوہدری غلام عباس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ عبداللہ چوہدری غلام عباس کے گھر گئے تاکہ پنڈت نہرو سے انکی ملاقات کروائیں، لیکن چوہدری صاحب نے پنڈت نہرو کو ملنے سے انکار کردیا۔

دیوناگری رسم الخط کا اجراء

اکتوبر 1940ء کو وزیراعظم گوپال سوامی آئینگر نے تعلیمی اصطلاحات کے ضمن میں ایک ایسا حکم جاری کیا جس کی رو سے تعلیمی اداروں کے لئے اُردو کو مشترکہ زبان قرار دیا، لیکن فارسی رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط کو بھی لکھنے اور پڑھنے کے لئے ضروری قرار دیا۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی مسلمانوں میں اضطراب پھیل گیا اور انہوں نے اس فیصلے کیخلاف اسمبلی کے اندر اور باہر احتجاج کیا۔ چوہدری حمیداللہ خان نے اس فیصلے کیخلاف اسمبلی میں اعتراض پیش کیا۔ نیشنل کانفرنس کے ممبران اسمبلی نے پارٹی ہدایت پر استعفے دے دیئے۔

اسلحہ ایکٹ کی منظوری

25 اکتوبر 1940ء کو حکومت نے اسمبلی کے اجلاس میں ایک ایسا ایکٹ پاس کروالیا جس کی رو سے ریاستی باشندوں کے لئے بغیر لائسنس اسلحہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا، لیکن ہندو راجپوتوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس امتیازی قانون کے خلاف ممبرانِ اسمبلی نے اور مسلم عوام نے احتجاج کیا، لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔

نیشنل کانفرنس میں انتشار

نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آتے ہی اس جماعت کو انتشار کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو وہ لوگ اس جماعت سے الگ ہوگئے جو مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان مخالفین نے بڑھ چڑھ کر نیشنل کانفرنس کی مخالفت شروع کردی۔ دوسری طرف غیر مسلموں نے بھی نیشنل کانفرنس کیخلاف اس بنیاد پر محاذ آرائی شروع کردی کہ مسلمان ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کی جداگانہ حیثیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور ریاست میں "مسلم راج" قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لاتے وقت شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ انہیں مسلمانوں نے جس طرح بے پناہ عزت اور احترام دیا ہے، اس طرح غیر مسلم بھی اُنہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور حکومتِ وقت اُن کی سیاسی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال دے گی، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ جماعت کے دو سینئر رہنما شیخ محمد عبداللہ اور چوہدری غلام عباس غیر مسلموں کی حمایت حاصل کرنے کے چکر میں اپنے مسلمان دوستوں اور

عوام کی حمایت بھی کھو بیٹھے۔ جموں میں چوہدری غلام عباسؒ کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔

نیشنل کانفرنس کے قیام کے فوری بعد جماعت نے مسلمانوں کے مقدس مقامات اور دینی و مذہبی معاملات کی نگرانی کے لئے ''اوقاف کمیٹی'' قائم کی۔ اس کمیٹی کے زیر اہتمام جب مسلمان عید میلاد النبیؐ کے جشن کی تیاری کرنے لگے تو پنڈتوں نے اس پر اعتراض کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ جشن عید میلاد النبیؐ مسلم کانفرنس ہر سال کے اہتمام سے مناتی تھی اور اس میں غیر مسلم بھی شرکت کرتے تھے، لیکن اس بار جب نیشنل کانفرنس نے یہ تقریب کا اہتمام کیا تو پنڈت ناراض ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نے ایک مذہبی تقریب میں اسلام کو سورج اور باقی مذاہب کو ستاروں سے تشبیہ دی تو پنڈتوں نے شیخ عبداللہ کی زبردست مخالفت کی، جس کے جواب میں شیخ عبداللہ کو مجبوراً کہنا پڑا کہ ''میں اوّل و آخر مسلمان ہوں''۔

نیشنل کانفرنس نے غیر مسلموں سے جو اُمیدیں وابستہ کی تھیں ان کی حقیقت بہت جلد آشکارا ہو گئی۔ پنڈتوں کے معروف راہنما پنڈت جیالعل کلم اور پنڈت کشپ بندھو نیشنل کانفرنس چھوڑ گئے اور پھر پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی شیخ عبداللہ اور اپنی پنڈت برادری کے روّیے کے سبب کنارہ کش ہو گئے۔ شیخ عبداللہ کے لئے یہ صورتحال پریشان کن بن گئی، کیونکہ وہ اگر کسی مسئلے پر مسلمانوں کے حق کی بات کرتے تو غیر مسلم ان پر مسلمانوں کی طرفداری کا الزام لگاتے اور اگر وہ غیر مسلموں کے حق کی بات کرتے تو انتہا پسند مسلمان ان پر ہندوؤں کا طرفدار ہونے کا الزام لگاتے۔ شیخ عبداللہ مرزا غالب کے اس شعر کی عملی تصویر بن گئے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لاتے وقت مسلم اور غیر مسلم راہنماؤں نے کچھ امور پر اتفاق رائے کیا اور آئندہ انکی پاسداری کا عزم کیا تھا۔ ان میں سے ایک اہم نقطہ یہ تھا کہ ''نیشنل کانفرنس کو انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے زیر اثر نہیں لایا جائے گا، نہ ہی نیشنل کانفرنس سیاسیاتِ ہند میں حصہ لے گی''۔ اس عہد کی پاسداری نہ کی گئی۔ اوّل تو شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس نے قراردادِ پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت شروع کی اور دوم شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی مسلم لیگ کی مخالفت اور کانگریس کے ہمنوائی کا دم بھرنے لگے۔ نہرو کے دورۂ کشمیر نے اس جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمان شیخ عبداللہ سے سخت مایوس ہو گئے۔ شیخ عبداللہ کی کانگریس نوازی کے سبب جموں، میرپور اور پونچھ میں نیشنل کانفرنس فروغ نہ پا سکی۔ کیونکہ ان علاقوں میں مسلمانوں میں مذہبی انتہا پسندی بہت زیادہ تھی اور وہ متحدہ قومیت کے نعرے کو کانگریس اور ہندوؤں کی ایک چال سمجھتے تھے۔ صوبہ جموں کے تمام سرکردہ راہنما آہستہ آہستہ نیشنل کانفرنس سے کنارہ کش ہو گئے۔ 28 ستمبر 1940ء کو بارہ مولا کے مقام پر جب نیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا تو صوبہ جموں سے کوئی نمایاں آدمی اس میں شریک نہ ہوا۔

نیشنل کانفرنس کی صفوں میں یہ ٹوٹ پھوٹ روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ نیشنل کانفرنس سے ناراض ہونے والے

والے سیاسی راہنما اور کارکن اس صورتحال سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے مسلم کانفرنس کے باضابطہ احیاء کی کوششیں تیز کر دیں۔ بالآخر کشمیری پنڈتوں کے روّیے سے تنگ آ کر شیخ محمد عبداللہ نے 28 جولائی 1941ء کو سرینگر میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"In a country like Kashmir where Kashmiri Pandits cannot even tolerate the construction of a bathroom by Muslims on the banks of Jhelum, what is the use of preaching Nationalism? People who cannot even tolerate the washing of hands and face by us on the banks of Jhelum, surely, cannot be united with us".

(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل صفحہ 547)

شیخ عبداللہ کا یہ بیان نیشنل کانفرنس کی حکمتِ عملی اور سیاسی فکر کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

مسلم کانفرنس کے احیاء کے لئے اخبارات ورسائل کا کردار

مسلم کانفرنس کو از سرِ نو معرضِ وجود میں لانے کے لئے ریاست کے ہفتہ وار اخبارات و رسائل نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ مسلمان صحافی جو نیشنل کانفرنس کے قیام سے ناخوش تھے اور مسلمانوں کی نمائندگی اور ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے، اُنہوں نے مسلم کانفرنس کے احیاء کے لئے قلمی محاذ پر موثر کردار ادا کیا۔

پروفیسر محمد سرور عباسی لکھتے ہیں:

''ریاست کے ہفتہ وار اخبارات میں سے جموں کے غلام حیدر خان غوری کے ''نوجوان''، منشی معراج الدین کے ''پاسبان'' اور سرینگر کے محمد ایوب کے ''البرق'' غلام محی الدین و محمد اسمٰعیل ساغر کے ''رہبر'' مولوی عبدالواحد کے ''اصلاح'' اور قریشی محمد یوسف کے ''پیغام'' نے نیشنل کانفرنس کیخلاف ریاستی مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کی موثر ترجمانی کے علاوہ کشمیر میں متحدہ قومیت کے مضمرات اور مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی ضرورت کے لئے رائے عامہ کو منظم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا''۔

(پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 277)

جسٹس محمد یوسف صراف صحافتی کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"In June 1940 a weekly newspaper, "Paigham" owned by Late Mr. Yusuf Qureshi and edited by Mr. Nizam-ud-Din, started publication from Srinagar and campaigned for the revival of Muslim Conference. Yet another weekly, Al-Islah, owned by the Ahmedis, also launched a campaign condemning the formation of the National Conference and for revival of the Muslim Conference".

(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" صفحہ 553)

اخبارات ورسائل کی بڑھتی ہوئی مخالفت کو دیکھ کر نیشنل کانفرنس کے راہنما چوہدری غلام عباس
کے مدیران کو ایک خط لکھا، جس میں نیشنل کانفرنس کا دفاع کرنیکی کوشش کی گئی تھی، لیکن اس خط کا خاطر خواہ اثر نہ

چوہدری غلام عباس کی نیشنل کانفرنس سے علیحدگی

چوہدری غلام عباس نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد کسی واضح سوچ اور نظریے پر کاربند
1940ء کو جب پنڈت نہرو نے کشمیر کا دورہ کیا تو نیشنل کانفرنس نے اس کا استقبال کیا۔ چوہدری غلام عباس
استقبالی تقریبات میں شرکت نہ کی اور پنڈت نہرو کو ملنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شیخ عبداللہ اور چوہدری
مابین شدید تلخ کلامی ہوئی، جس نے مستقل ناراضگی کی شکل اختیار کر لی۔ بالآخر اگست 1940ء میں چوہدری
نے نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر لی اور گوشہ نشین ہو گئے۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

''اب میرے لئے خاموشی اور سیاست سے کنارہ کشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں خوش تھا کہ اب
زندگی سے ستانے کا موقع مل گیا اور سکونِ قلب نصیب ہوا''۔ (چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ

چوہدری غلام عباس کی دیکھا دیکھی صوبہ جموں کے کچھ دوسرے راہنماؤں نے بھی نیشنل کانفرنس سے
اختیار کر لی۔ اس پر نیشنل کانفرنس کے مخالفین اور مسلم کانفرنس کو از سر نو منظم کرنے کے خواہشمندوں نے خوشی

مسلم کانفرنس کے احیاء کا اعلان

10 اکتوبر 1940ء کو جموں کے ایک مقتدر سیاسی راہنما سردار گوہر رحمٰن خان کی کوششوں سے
ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا، جس میں اُن لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی، جو مسلم کانفرنس کو از سر نو منظم
خیال سے متفق تھے۔ یہ اجلاس منشی محمد دین فوق کی صدارت میں ہوا اور اس میں حسب ذیل شخصیات نے شرکت

۱) سردار گوہر رحمٰن خان (جموں شہر)	۸) چوہدری عبدالکریم ایم ایل اے
۲) سردار فتح محمد خان ایم ایل اے (پونچھ)	۹) چوہدری حمید اللہ خان ایم ایل اے
۳) مرزا عطاءاللہ خان ایم ایل اے (راجوری)	۱۰) منشی محمد دین فوق
۴) قاضی عبدالغنی دلنہ ایم ایل اے (بارہ مولا)	۱۱) سید حسن شاہ جلالی
۵) پیر ضیاءالدین ایم ایل اے (بڈگام)	۱۲) خواجہ محمد یوسف قریشی
۶) بابو محمد عبداللہ ایم ایل اے (جموں)	۱۳) محمد اسمٰعیل ساغر
۷) غلام حیدر غوری ایڈیٹر نوجوان (جموں)	۱۴) سید میرک شاہ

ان راہنماؤں نے مشترکہ دستخطوں سے ایک اعلان جاری کیا، جس میں مسلم کانفرنس کو از سر نو بحال
ظاہر کیا گیا۔ ان راہنماؤں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس کا نام دینے اور اسکے آئین میں تبدیلی لانے کے عمل

کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلم کانفرنس کا نام اور آئین برقرار ہے اور مسلم کانفرنس اپنی جدوجہد جاری رکھے گی۔
جسٹس محمد یوسف صراف مذکورہ اعلان کا اقتباس یوں رقم کرتے ہیں:

"It is not our intention to enter, at present, into a public debate about the merits and demerits of the formation of the National Conference; nor do we desire to say, at this stage, as to what consequences have flowed from it and how it has damaged the larger interests of Muslims; however, we have arrived at the conclusion that the purpose for which the so-called nationalists elements among the Hindus desired the formation of the National Conference was to kill two birds with one stone; they were not able to do so by themselves and, therefore, resorted to the help and cooperation of Muslim leaders.

An important session of the Muslim Conference is being convened very soon and all sympathizers and well-wishers will be invited for participation so that by joining our heads, we may be able to evolve an agreed programme"

(جسٹس محمد یوسف صراف *"Kashmiri's Fight for Freedom"* جلد اوّل صفحہ 553-54)

مسلم کانفرنس کو بحال کرنے کے خواہشمندانِ مسلم زعماء کے اعلان سے سیاسیاتِ کشمیر میں نئی تازگی اور نمو
ہوگئی۔ نیشنل کانفرنس کی صفوں میں ہلچل مچ گئی، کیونکہ یہ اعلان کانفرنس کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔
جسٹس محمد یوسف صراف اس اعلان کے اثرات کو یوں بیان کرتے ہیں:

"It was a courageous statement of far-reaching importance. At a time when the entire top leadership of the Muslim Conference had put its whole weight on the side of 'nationalism' and none of them had the courage of conviction to come forward to provide Muslims with an alternate leadership, these fourteen leaders, some of whom belonged to the second rank of Party leadership while some were even farther below, displayed great courage and unusual initiative in challenging the top leadership of the National Conference to a public duel. The Muslims of Kashmir owe them a debt of gratitude.

(جسٹس محمد یوسف صراف *"Kashmiri's Fight for Freedom"* جلد اوّل صفحہ 554)

مسلم کانفرنس کا باقاعدہ احیاء

مسلم کانفرنس کے احیاء کی قرارداد پاس کرنے والے مسلم زعماء نے چوہدری غلام عباس سے مسلسل رابطہ رکھا اور

انہیں دوبارہ سیاست میں آنے اور مسلم کانفرنس کی قیادت سنبھالنے کی کئی بار دعوت دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے [illegible] کو توڑتے ہوئے 26 جنوری 1941ء کو ایک بیان جاری کیا، جس میں انہوں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس [illegible] کرنے کے بعد پیش آمدہ سیاسی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے سنگین غلطی قرار دیا اور مسلمانان ریاست سے اپیل کی [illegible] مسلم کانفرنس کو از سرِ نو زندہ کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ چوہدری غلام عباس کے اس بیان کا ہر جگہ خیر مقدم کیا گیا [illegible] کانفرنس کے احیاء کی کوششوں میں مصروفِ عمل سیاسی کارکنوں کو اب اپنی کاوشیں ثمر بار ہوتی نظر آئیں۔ چنانچہ [illegible] سردار گوہر رحمٰن خان نے اپنے گھر میں 3 اپریل 1941ء کو ایک اجلاس بلایا، جس کی صدارت چوہدری غلام عباس [illegible] اس اجلاس میں مسلم کانفرنس کے احیاء کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ قائدین و کارکنان نے قرآن مجید پر اجتماعی حلف [illegible] ہوئے اس امر کا اقرار کیا کہ وہ مسلم کانفرنس سے اپنی وفاداری استوار رکھیں گے اور اس کے نصب العین کو حاصل کرنے [illegible] کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔

مسلم کانفرنس کے باقاعدہ احیاء کا اعلان ہوتے ہی صوبہ جموں میں اسکا خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھی جماعت کی تنظیم نو کے لئے متحرک ہو گئے۔ وادی میں میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور قریشی محمد یوسف وغیرہ نے بھی اسکا خیر مقدم کیا۔ نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی کے 5 ممبران نے بھی مسلم کانفرنس میں شمولیت کا اعلان کیا۔ یون اسمبلی میں مسلم کانفرنس کے ممبران کی تعداد 12 ہو گئی۔ میر پور، پونچھ اور راجوری میں کئی سرکردہ لوگوں نے نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی۔

مسلم کانفرنس کا تاسیسی اجلاس

مسلم کانفرنس کا احیاء عمل میں آنے کے بعد اس کا پہلا تاسیسی اجلاس 17، 18، 19 اپریل 1942ء کو [illegible] کیمپ جموں میں ہوا۔ چوہدری عبداللہ خان بھلی استقبالیہ کمیٹی کے چیئر مین تھے۔ روزنامہ ''زمیندار'' لاہور کے ایڈیٹر مسلم لیگ کے راہنما مولانا ظفر علی خان نے افتتاحی نشست کی صدارت کی۔ انہوں نے مسلم کانفرنس کا جھنڈا لہرانے کی رسم بھی ادا کی۔ بقیہ اجلاس کی صدارت چوہدری غلام عباس نے کی۔ اس اجلاس میں کئی قراردادیں پاس کی گئیں جن میں وزیر اعظم گوپال سوامی آئینگر کیخلاف عدم اعتماد، ذمہ دار نظامِ حکومت کا قیام، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے جائز تناسب، دیوناگری رسم الخط کے خاتمے، اسلحہ ایکٹ کی منسوخی اور قراردادِ پاکستان کی حمایت میں قراردادیں شامل تھیں۔

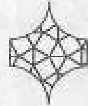
چوہدری غلام عباس کو متفقہ طور پر صدر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے حسب ذیل مرکزی عہدیداران اور ممبران مجلس عاملہ کا اعلان کیا۔

۱۔	سینئر نائب صدر	مولانا میرک شاہ اندرابی
۲۔	جنرل سیکرٹری	اللہ رکھا ساغر
۳۔	پبلسٹی سیکرٹری	چوہدری عبداللہ خان بھلی

اراکین مجلس عاملہ:

صوبہ کشمیر: مولوی غلام مصطفےٰ، قریشی محمد یوسف، ایم اے حفیظ، قاضی عبدالغنی دلنہ، خواجہ عبدالسلام دلال، پیر ضیاء الدین اندرابی، محمد اسمٰعیل ساغر۔

صوبہ جموں: چوہدری حمید اللہ خان، سردار گوہر رحمٰن خان، مولوی محمد حسین، سردار فتح محمد خان کریلوی، چوہدری عبدالکریم، حکیم میاں قربان احمد، مولوی محمد عبداللہ، چوہدری غلام حسین لسانوی۔



10

"کشمیر چھوڑ دو" تحریک

(Quit Kashmir Movement)

پسِ منظر:

1945-46 میں برطانوی ہند میں مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے 100 فی صد کامیابی حاصل کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ یہ انتخابات ریاست جموں کشمیر میں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی سیاسی کشمکش پر بھی اثر انداز ہوئے۔ مسلم کانفرنس نے بھی مسلمانانِ ریاست جموں کشمیر کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا پرچار شدّ ومدّ سے شروع کر دیا تو نیشنل کانفرنس کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنا کر اُسے بے اثر نہ کر دے۔ اِدھر حکومتی اور عوامی حلقوں میں نیشنل کانفرنس کا وقار دن بدن گرتا جا رہا تھا کیونکہ نیشنل کانفرنس کے ایک سرکردہ راہنما مرزا افضل بیگ گذشتہ ڈیڑھ سال سے حکومتی کابینہ میں بحیثیت وزیرِ تعمیراتِ عامہ شامل تھے۔ لیکن وہ عوام اور پارٹی کے لیے کوئی خاطر خواہ کام نہ کر سکے۔ وزیر اعظم رام چند کاک در پردہ نیشنل کانفرنس کو کمزور کرنے میں مصروف تھا۔ اپنے انہی عزائم کی تکمیل کے لیے اس نے مرزا افضل بیگ کے کام میں روڑے اٹکانے شروع کیے۔ بالآخر افضل بیگ نے 18 مارچ 1946ء کو وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ وزیرِ اعظم نے نیشنل کانفرنس کے خلاف ایک اور چال چلی اور کانفرنس کے پارلیمانی لیڈر میاں احمد یار خان کو مرزا افضل بیگ کی جگہ وزارت کے عہدے کی پیش کش کی جسے میاں احمد یار خان نے قبول کر لیا چنانچہ انہیں 17 اپریل 1946ء کو وزارت دے دی گئی۔ عوامی سطح پر نیشنل کانفرنس کا وقار پہلے ہی گر چکا تھا۔ اس تبدیلی نے اسے اسمبلی میں بھی انتشار کا شکار کر دیا۔ ان ایام میں نیشنل کانفرنس عجیب کشمکش اور بے یقینی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ ریاست میں موجود نہیں تھا وہ بمبئی گیا ہوا تھا۔ شیخ عبداللہ، رام چند کاک کے خلاف شکایات کا انبار لے کر بمبئی جا پہنچے لیکن جب مہاراجہ نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تو شیخ عبداللہ سخت سیخ پا ہوئے اور مہاراجہ اور وزیر اعظم کو سبق سکھانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں وہ دہلی چلے گئے تا کہ گاندھی سے ملاقات کر کے اُن سے صورتِ حال پر تبادلہ خیال کریں۔ گاندھی سے ملاقات کے دوران جب انہوں نے مہاراجہ کے خلاف تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا تو گاندھی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس موقع پر ایسی تحریک شروع نہ کریں۔ چنانچہ وہاں سے شیخ عبداللہ لاہور آ گئے۔ لاہور میں انہوں نے اپنے کمیونسٹ دوستوں سے مشورہ کیا تو ان دوستوں نے رائے دی کہ مہاراجہ کے خلاف بغاوت کی

ایک [illegible] شروع کر دی جائے۔ چنانچہ شیخ عبداللہ نے مہاراجہ ہری سنگھ اور وزیرِ اعظم رام چند کاک کو سبق سکھانے [illegible] نیشنل کانفرنس کا وقار بحال کرنے کے خیال سے لاہور میں ہی نہایت عجلت سے ایک میمورنڈم تیار کیا جسے "Quit Kashmir Memorandum" کا نام دیا گیا۔

کیبنٹ مشن کے نام یادداشت:

ان دنوں برطانوی حکومت نے ایک کابینہ مشن ہندوستان کے دورے پر بھیجا ہوا تھا تا کہ ہندوستان کی [illegible] ہاتھوں سے ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی منتقلی کے مسئلہ پر متفقہ فارمولا طے کیا جا سکے۔ اس وفد کی قیادت وزیرِ [illegible] پیتھک لارنس کر رہے تھے ان کے ہمراہ دو ممبران سر سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر الیگزنڈر بھی تھے۔ یہ وفد 19 اپریل کو [illegible] کراچی پہنچا اور 24 اپریل کو واپس آ گیا۔ شیخ عبداللہ نے لاہور سے ہی اس وفد کو ایک یادداشت ارسال کی۔ یادداشت کا متن حسب ذیل ہے۔

"آج کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ مہاراجہ کے شخصی نظام سے مکمل آزادی کا حق چاہتے ہیں۔ ایک سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کشمیر کا سودا ہوا۔ صرف 75 لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض جو آج برطانوی سکے کے مطابق پانچ لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ سے بھی کم رقم بنتی ہے۔ کشمیر، اس کے عوام، اس کے سبزہ زار اور مرغزار اور اس قسم کے تمام وسائل سکھ سلطنت کے ایک باجگذار راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیئے گئے۔ اُس وقت کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے اس معاہدے کے سلسلے میں کشمیر کا سودا کرنے کی مزاحمت کی لیکن اُسے برطانوی فوج کی مدد سے مطیع بنا دیا گیا۔ اس طرح سے 1846ء کے اس بکری پتر نے جس کو غلطی سے معاہدہ امرتسر کہا جاتا ہے، کشمیریوں کی قسمت پر مُہر لگا دی۔ ہم اس بیع نامے کی اخلاقی اور سیاسی حیثیت کو چیلنج کرتے ہیں۔ جس میں کشمیری عوام کبھی فریق نہیں رہے اور جو 1846ء سے ان کی غلامی کی دستاویز رہتا چلا آیا ہے۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کے باشندگان کا مستقبل طے کیا جا رہا ہے اور برطانوی کیبنٹ مشن مستقبل کا آئینی ڈھانچہ تشکیل دے رہا ہے۔ اس لیے راجواڑوں کے معاہدات کرنے کا حق اس وقت ریاستوں کے عوام، راجواڑہ شاہی اور بالادستی رکھنے والی طاقت کے درمیان ایک اہم مسئلے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہم کشمیریوں کے لیے اس رشتے کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ایک انتہائی اہم معاملہ بن گیا ہے۔ ہمارے موقف کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اس بیع نامہ کو، جس کی وجہ سے کشمیر ڈوگرہ مہاراجوں کے زیرِ عنان آیا، اُن حقوق کے موافق کوئی حق عطا نہیں کرتا، جن کی بنا پر ان ریاستوں کا نظام چلایا جاتا ہے۔ جن پر معاہدات سے پیدا شدہ حقوق کی عملداری ہے۔ اس لحاظ سے کشمیر کا معاملہ ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے اور کشمیر کے عوام کیبنٹ مشن کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی حکمرانی کے خاتمے کے بعد انہیں آزاد رہنے کا حق حاصل ہے۔ 1846ء کا بیع نامہ جسے غلطی سے معاہدہ امرتسر کہہ کر پکارا جاتا ہے اس دعوے کو اظہر من الشمس بنا دیتا ہے۔ کوئی بکری پتر، چاہے اس کے تقدس کا کتنا ہی ڈھنڈورہ کیوں نہ پیٹا جائے، چالیس لاکھ سے زیادہ عورتوں اور مردوں کو ایک تانا شاہ کا غلام نہیں بنائے رکھ سکتا۔ جب وہ اس کے زیر

نکلیں نہ رہنے پر آمادہ ہوگئے ہوں۔ ہم کشمیری عوام اپنی تقدیر خود بنانے کی قسم کھا چکے ہیں۔ اور کیبنٹ مشن سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے موقف کی قُوت اور انصاف کا اقرار کر لیں۔ کشمیر عظیم برِصغیر ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ایک جغرافیائی وحدت ہی نہیں ہے۔ جو اپنی خوبصورتی اور قدرتی دولت کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اس کا محلِ وقوع نہایت اہم فوجی اور سیاسی نوعیت کا ہے، یہ ہندوستان، چین اور روس کا مقام اتصال ہے اور اس لحاظ سے اس کی بین الاقوامی اہمیت ہے۔ ہمارا وطن کشمیری قوم کا گہوارہ ہے، جو اپنی زبان، کلچر اور روایت کی ہم آہنگی اور اپنی مشترکہ جدوجہد کی تاریخ کے لحاظ سے ہندوستان میں ایک نادر روزگار جگہ ہے جہاں تمام فرقے اور طبقے ایک مُتحدہ قومی مُطالبے کی پشت پناہی کر رہے ہیں''۔

(شیخ محمد عبداللہ ''آتشِ چنار'' صفحہ 357-59 دیکھئے انگریزی عبارت "Kashmir on Trail" صفحہ 1 تا 3)

کیبنٹ مشن کو یادداشت ارسال کرنے کے کچھ روز بعد شیخ عبداللہ لاہور سے سری نگر آ گئے۔ تحریک کا خاکہ وہ لاہور سے ہی اپنے ذہن میں بنا کر لائے تھے۔ سری نگر پہنچ کر انہوں نے نیشنل کانفرنس کے مقامی قائدین و کارکنان کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں تحریک کو باقاعدہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں پہلا جلسہ 15 مئی 1946ء کو سری نگر میں ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ خود بتاتے ہیں۔

''میں نے پہلی تقریر 15 مئی 1946ء کو مائیسمہ میں دھن جی بھائی اڈے کے احاطے میں کی اور اعلان کیا کہ انگریزوں کے جانے کے ساتھ ہی وہ تمام راجے اور مہاراجے بھی چلے گئے ہیں جو انگریز سامراج کے پٹھوؤں کی حیثیت سے اپنی رعایا پر مُسلط تھے۔ اور وہ سارے مُعاہدے بھی کالعدم ہو گئے ہیں۔ جو ناجائز طریقے سے عمل میں لائے گئے تھے۔ اور جن کا منشا عوام کو اُن کی مرضی کے خلاف طوقِ غلامی پہنانا تھا۔ میں نے ایک اور تقریر زیندار محلہ میں کی اور کہا کہ ہم ایک ایک روپیہ اکٹھا کر لیں گے اور اس طرح سے پچھتر لاکھ روپے کی وہ رقم مہاراجہ کو واپس کریں گے۔ جس کے عوض اُس کے پردادا مہاراجہ گلاب سنگھ نے آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے کشمیر کو خرید لیا تھا۔ میں نے ایک اور تقریر اندرونِ شہر میں کی۔ میری تقریریں اس قدر جوشیلی تھیں کہ سارے کشمیر میں عزم اور ولولے کا ایک الاؤ روشن ہو گیا۔

(شیخ محمد عبداللہ ''آتشِ چنار'' صفحہ 359-60)

شیخ عبداللہ کی جذباتی تقاریر نے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں میں زبردست جوش و جذبہ پیدا کر دیا اور وہ ''کشمیر ہمارا چھوڑ دو، معاہدہ امرتسر توڑ دو'' کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ تحریک کے اس نعرے میں بظاہر انقلابی جذبہ نظر آ رہا تھا کیونکہ اسی سال مارچ میں معاہدہ امرتسر کو ایک سو (100) سال پورا ہو چکا تھا اور تحریک کے بانیوں کا مدعا یہ تھا کہ سو برس بیت جانے کے بعد اب ڈوگرہ خاندان کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں لہٰذا انہیں کشمیر چھوڑ کر چلے جانا چاہیے۔

19 مئی کو تحریک کا آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے نیشنل کانفرنس کے قائدین نے ایک میٹنگ منعقد کی جس میں طے پایا کہ تحریک کو سفارتی سطح پر منظم کرنے کے لیے بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق لاہور جا کر کام کریں۔ مرزا افضل بیگ ضلع اننت ناگ میں، خواجہ غلام محی الدین قرہ سری نگر میں تحریک کو منظم کریں جب کہ شیخ عبداللہ پنڈت جواہر لعل نہرو سے صلاح مشورے کے لیے دہلی چلے جائیں۔

شیخ عبداللہ کی گرفتاری:

شیخ محمد عبداللہ اپنی سوانح عمری ''آتشِ چنار'' میں اپنی گرفتاری کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''چنانچہ کشمیر کے حالات کی بھنک جونہی جواہر لعل نہرو کے کان میں پڑی انہوں نے مجھے دہلی آنے اور بات چیت کرنے کا سندیسہ بھیجا۔ 19 مئی کو میں نے اپنے رفقاء کے ساتھ بات چیت کی اور 20 مئی صبح کو میں راولپنڈی روڈ کے ذریعے دہلی کی طرف چل پڑا۔ جب میں ضلع مظفر آباد میں سراں اور کوہالہ کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ راستے کے بیچوں بیچ ایک بھاری پتھر رکھا گیا ہے اور پولیس کی ایک جمعیت موجود ہے۔ میری کار رکائی گئی۔ مجھے ڈیفنس رولز کے تحت جاری کیا گیا ایک وارنٹ دکھایا گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ لیکن مجھے اس تاریکی میں گڑھی کے ڈاک بنگلہ تک پہنچایا گیا۔ جہاں میں نے رات بسر کی۔ دوسرے روز علی الصبح لا کر اسی دن واپس سری نگر پہنچایا گیا اور بادامی باغ کے کوارٹر گارڈ میں رکھا گیا۔ مجھے چھتہ بل کے راستے سے شہر نہیں لایا گیا بلکہ مانسبل کے لمبے راستے سے لایا گیا تاکہ شہر سے میرا گذر نہ ہو اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ لیکن میری گرفتاری کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی اور فوراً ہی وسیع پیمانے پر مظاہرے، جلسے اور جلوس شروع ہو گئے۔ حکومت نے رات کی تاریکی کے پردے میں شہر میں ہی کیا وادی کے اہم ناکوں پر بھی پولیس اور فوج بچھا دی تھی''۔

جلسے، جلوس اور گرفتاریاں:

20 مئی سوموار کی سہ پہر کو جب شیخ عبداللہ کو مظفر آباد کے قریب سے گرفتار کیا گیا عین اسی لمحے مہاراجہ ہری سنگھ جموں سے سری نگر میں وارد ہوئے۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کی خبر پولیس نے بذریعہ تار اسی لمحے مہاراجہ کو پہنچائی۔ شام تک سری نگر کے گلی کوچوں میں یہ خبر پھیل چکی تھی۔ اگلے روز جب شیخ عبداللہ کو سری نگر لایا گیا تو نیشنل کانفرنس نے پہلے سے طے شدہ تحریک کا آغاز کر دیا۔ ہر طرف جلسے، جلوس اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ ایک وار کونسل کا اعلان کیا گیا جس کا ڈکٹیٹر غلام محی الدین قرہ کو مقرر کیا گیا۔ اس تحریک کے دوران مارپیٹ اور قتل و غارت کے جو واقعات پیش آئے ان کی منظر کشی کوب نیوز ایجنسی کے ایک عینی شاہد نامہ نگار نے یوں کی تھی۔

''آن کی آن میں گورکھوں اور ڈوگرہ سپاہیوں کے جھنڈ کے جھنڈ سری نگر اور اس کے مضافات پر چھا گئے۔ اور شہر کے گرد ایک فولادی حلقہ ڈال دیا گیا۔ ایک مشینی باقاعدگی کے ساتھ بڑے پیمانے پر انسانوں کا شکار شروع کیا گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر سینکڑوں انسان فوجی لاریوں میں بٹھا بٹھا کر بادامی باغ چھاؤنی میں لائے گئے اور سپاہیوں کے حوالے کیے گئے۔ گورکھے سپاہیوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ڈوگرہ سپاہی گھر بہ گھر تلاشیاں کرنے میں مصروف تھے اور کشمیر پولیس والوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں دے کر انہیں بازاروں میں گشت کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ جارحانہ کارروائیوں کا ایک مرکز (آپریشنل ہیڈ کوارٹرز) قائم کر دیا گیا۔ اس کا مقصد ساری ریاست میں فوج اور پولیس میں رابطہ قائم کرنا اور تمام جارحانہ اقدامات کو ڈائریکٹ کرنا تھا۔ اسی مقام سے

ساری ریاست میں فوج اور پولیس کی کارروائیوں کی رہنمائی کی جاتی تھی۔ لاریوں پر موٹے لوہے کے جال لگائے گئے تھے۔ سپاہی فولادی خود پہنے رہتے تھے اور مجسٹریٹ اور دوسرے حاکموں کو ریوالور دیئے گئے تھے۔ اور پرشنل ہیڈ کوارٹرز میں درجنوں موٹر سائیکلسٹ موجود رہتے تھے۔ تاکہ ٹیلیفون وغیرہ کے کٹ جانے کے وقت انُ کے ذریعہ سے سلسلۂ نامہ و پیام قائم رکھا جا سکے۔ سپاہیوں کے گشتی دستے جو ہر قسم کے مہلک ہتھیاروں سے لیس رہتے تھے شہر اور دیہات کے کونے کونے میں گشت کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ سوموار اور منگل وار کے حالات ہیں۔

بدھوار کے روز تین سو آدمی گرفتار ہو چکے تھے۔ 20 سے زیادہ مر چکے تھے اور سینکڑوں زخمی ہو چکے تھے۔ ہدایات جو کہ فوجیوں کو دی گئی تھیں، یہ تھیں کہ اگر ممکن ہو تو گولی نہ چلائیں لیکن ضرورت کے وقت گولی چلانے سے ہرگز دریغ نہ کریں۔

اس کے باوجود حکومت کے پریس نوٹ میں منگل وار کے روز ایک موت کی خبر دی گئی تھی۔ بعد میں اس ایک کو 6 بنایا گیا۔ اخبارات کے نامہ نگاروں کو یہ سن کر صدمہ ہوا کہ جو مفصل پیغامات انہوں نے تار کے ذریعہ بروقت بھیجے تھے وہ 24 گھنٹے یا اس سے زیادہ دیر کے لیے روکے گئے اور پھر جب ان کو بھیجا گیا تو ان کو سنسر کر کے کانٹ چھانٹ کر کے اور بالکل مسخ شدہ صورت میں اس وقت جانے دیا گیا جب ان کی اخباری اہمیت زائل ہو چکی تھی۔ ایک نامہ نگار نے مرنے والوں کی تعداد چھ لکھی تھی۔ لیکن ریاست کے سنسر نے ''چھ'' کاٹ کر ایک کا ہندسہ درج کر دیا تھا۔

بدھوار اور جمعرات کو فوجیوں نے شہر کے تمام ناکوں اور پلوں پر زبردست پہرے قائم کئے اور راہ چلتے آدمیوں کو مجبور کرتے رہے کہ وہ ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اور ''مہاراجہ کی جے'' کہتے ہوئے چلیں۔ جو لوگ ایسا کرنے سے انکار کرتے یا جھجکتے ان کو بندوقوں کے کندھوں اور سنگینوں کی نوکوں سے ایسا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ بعد میں لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنی ایک ایک ٹانگ اوپر کر کے لنگڑاتے اور ''مہاراجہ کی جے'' کہتے ہوئے گزر جائیں۔ بعض لوگوں کو گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کیا گیا۔ معمر اور معزز شہریوں کو پیٹ کے بل رینگنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں اور میوے اور سگریٹ بیچنے والوں سے زبردستی اشیاء چھین لی گئیں۔ پورے 48 گھنٹے شہر پر دہشت زدگی کا دور دورہ رہا۔ ساری دکانیں بند رہیں اور لوگ خوف کے مارے اپنے اپنے مکانوں میں پناہ گزین ہوئے۔ وکیلوں، پروفیسروں حتیٰ کہ گورنمنٹ کے ملازموں کو بھی خندقیں پُر کرنے اور سڑکیں صاف کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کالج اور سکول خالی ہو گئے۔ کیونکہ طلباء گھروں سے باہر آنے کی جرأت نہیں کر سکے۔

ایک بوڑھے دکاندار کو جس نے بلا قیمت سگریٹ دینے سے انکار کیا تھا گورکھا سپاہیوں نے دکان سے باہر گھسیٹ لیا اور زمین پر لٹا کر اُسے بندوقوں کے کندوں سے اس وقت تک زدوکوب کرتے رہے جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گیا۔ یہ بوڑھا دکاندار دوسرے روز مر گیا''۔

(بحوالہ ''کشمیر چھوڑ دو'' از جی ایم صادق صفحہ 39,41)

حالات کی منظرکشی پنڈت پریم ناتھ بزاز یوں کرتے ہیں۔

''دوسرے دن 22 مئی کو شہر کے کونے کونے میں ڈوگرہ فوج متعین کر دی گئی اور نہایت منظم اور طے شدہ ضابطے کے ساتھ نیشنل کانفرنس کے اہم اور غیر اہم کارکنوں کو جن کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی حراست میں لے کر سنٹرل جیل بھیج دیا گیا...... نیشنلسٹوں نے شہر میں چھوٹے چھوٹے جلوس نکالے، فوج اور پولیس کے ساتھ تصادم بھی ہوا۔ جس کے باعث انہوں نے ہجوم پر لاٹھی چارج بھی کیا۔ ایک مقام پر فوج کو گولی چلانا پڑی جس سے دو اشخاص ہلاک اور دس زخمی ہوئے۔

ڈوگرہ فوج نے انتہائی بدسلوکی سے کام لیا۔ انہوں نے کیا ہندو کیا مسلمان خواہ نیشنلسٹ تھے یا نہیں ان پر انتہائی زیادتیاں کیں۔ تمام لوگوں کو جنہیں ایسی جگہوں یا پلوں پر سے جہاں فوج متعین تھی گزرنا پڑا۔ تو ہاتھ اٹھا کر کے مہاراجہ بہادر کی جے'' پکارنے پر مجبور کیا جاتا۔ کئی ایک دکانیں محض اس بہانے کی آڑ میں لوٹ لی گئیں کہ دکاندار نقد قیمت ادا کرنے کے باوجود فوجیوں کو سودا نہیں دیتے۔''

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر'' اردو ترجمہ عبدالحمید نظامی صفحہ 264)

کشمیری پنڈتوں کو اس تحریک سے الگ رکھنے کے لیے تحریک کے شروع میں ہی کچھ پنڈت راہنماؤں کو بھی حکومت نے نظر بند کر دیا۔ ان میں پنڈت کشپ بندھو، پنڈت شام لال صراف، مسٹر ڈی پی دھر اور جانکی ناتھ زتشی وغیرہ شامل تھے۔

ان حالات میں حکومت نے ایک پریس نوٹ جاری کر کے صورت حال کی وضاحت یوں کی۔

''شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو اس بناء پر گرفتار کیا گیا ہے کہ انہوں نے اور ان کی جماعت کے دوسرے ارکان نے پچھلے دو ہفتوں میں ایسی مسلسل قابلِ اعتراض تقریریں کی ہیں جن میں لوگوں کو موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے، مہاراجہ سے وفاداری کا رشتہ توڑنے اور اُسے کشمیر چھوڑ دینے پر مجبور کرنے کے لیے اکسایا گیا تھا۔ مہاراجہ اور شاہی خاندان کو ایسی گندی گالیاں دی گئیں کہ جنہیں زبان پر لاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔''

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر'' اردو ترجمہ، عبدالحمید نظامی، صفحہ 263)

حکومت نے اسلحہ اور طاقت کے بے دریغ استعمال اور وحشیانہ تشدد کے ذریعے ایک عشرے کے اندر اندر تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔ ادھر بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق جو بروقت لاہور پہنچ چکے تھے انہوں نے لاہور میں بیٹھ کر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں اور ذرائع ابلاغ سے مسلسل رابطہ رکھا اور اس تحریک کے حق میں زبردست مہم چلائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان بھر میں یہ تحریک موضوع بحث بن گئی۔

کانگریس کی مداخلت اور نہرو کی گرفتاری :

کشمیر چھوڑ دو تحریک کے آغاز میں ہی کانگریس کے راہنما پنڈت جواہر لعل نہرو اس تحریک میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور دیگر حالات کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹیں انہیں مل رہی تھیں لہٰذا انہوں نے اپنی تمام تر توجہ کشمیر کے حالات پر مرکوز کر رکھی تھی۔ وہ تواتر سے ہندوستان کے اخبارات کو بیان جاری کرنے لگے جن میں کشمیر چھوڑ دو تحریک کی کھلم کھلا حمایت اور شیخ عبداللہ کی طرف داری اور حکومت کشمیر کی بھرپور مذمت ہوتی تھی۔ انہوں نے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے کہا:

''آج کل خاندانی حقوق اور خصوصی مراعات کا خوب چرچا کیا جا رہا ہے۔ لیکن کوئی خاندان یا فرد حق نہیں رکھتا کہ وہ عوام کے بنیادی حقوق کو دبائے رکھے۔ اگر حکمران قائم رہنا چاہتے ہیں تو وہ صرف اس صورت میں قائم رہ سکتے ہیں کہ ان کے لوگ اس سلسلے میں اپنی خوشنودی اور خواہش کا اظہار کریں''۔

...... مجھے معاہدہ امرتسر یا کسی اور معاہدے کے قانونی عواقب میں دلچسپی نہیں، مجھے اگر دلچسپی ہے تو وہ محض لوگوں کی بہتری اور ان کے اس حق سے ہے، جس کی رو سے وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی حکومت کس کی ہو۔

...... کشمیر میں جو کچھ ہوا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ریاست کی حکومت عوامی تحریک کو کسی نہ کسی بہانے کچل دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔

...... ہر وہ شخص جو کشمیر کو جانتا ہے لازمی طور پر اس قدر و منزلت کو بھی جانتا ہے جو شیخ عبداللہ کو وہاں حاصل ہے وہ کشمیر کی دور دراز وادیوں میں لوگوں کا محبوب اور ان کا ''شیرِ کشمیر'' ہے۔ اس کی شخصیت کے گرد لاتعداد افسانوں اور عوامی گیتوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ ریاستی عوام کی تحاریک میں میرے سب سے بڑے اور بیش قیمت ساتھی رہے اور میں ہر معاملے میں ان کی راہنمائی لیتا رہا ہوں''۔

(بحوالہ جی ایم صادق ''کشمیر چھوڑ دو'' صفحہ 46-47)

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے اخبارات میں بیان دیتے ہوئے کہا

''میرا دل شیخ عبداللہ اور اس کے ایثار پیشہ ساتھیوں کے لیے جب کہ وہ ایک بڑی امتحانی گھڑی سے گزر رہے ہیں، بے تاب ہو رہا ہے۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور بے گناہ مردوں اور عورتوں کے قتل کیے جانے سے مجھے بے حد دکھ ہوا''.... (24 مئی 1946ء)

(بحوالہ جی ایم صادق ''کشمیر چھوڑ دو'' صفحہ 49)

پنڈت نہرو نے ایک اور اخباری بیان میں وادی کشمیر کے حالات کی نقشہ کشی کرتے ہوئے اسے پنجاب کے 1919 میں نافذ کیے جانے والے مارشل لا سے تشبیہ دی، اس بیان میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ سری نگر میں مقتولین کی لاشیں پٹرول چھڑک کر جلائی جا رہی ہیں۔ اور فوج نے جامع مسجد سری نگر کی دیوار گرا دی ہے۔ پنڈت نہرو کا یہ بیان چونکہ خلافِ حقائق تھا، لہٰذا ریاستی ہندوؤں کا ایک وفد پنڈت شیونرائن فوطیدار کی قیادت میں انہیں دہلی میں ملا اور بتایا کہ مردوں کو جلانے یا جامع مسجد کی دیوار گرانے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا لہٰذا پنڈت نہرو نے فوراً اخبارات کو بیان جاری کیا۔

''دو واقعات ایسے ہیں جن کی میں تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ واقعات لاشوں کے جلائے جانے اور مسجد کی دیوار گرائے جانے سے متعلق ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے کافی ثبوت کے بغیر ان واقعات سے متعلق بیان دیا''۔

(بحوالہ پروفیسر سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 369)

پنڈت نہرو کے ان جھوٹے سچے اخباری بیانات کے نتیجے میں وزیر اعظم رام چند کاک نے نہرو پر الزام لگایا کہ وہ خواہ مخواہ کشمیر کے معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنی مداخلت کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس کا دفاع کیا۔ ان ہی دنوں پنڈت نہرو نے اپنا خصوصی ایلچی پنڈت دوارکا ناتھ کاچرو (سیکرٹری آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس) شیخ عبداللہ سے ملاقات کے لیے بھیجا اور شیخ کو اپنی مکمل حمایت کا تعین دلایا۔ کاچرو نے جیل میں شیخ عبداللہ سے ملاقات کی اور انہیں نہرو کا خط بھی دیا۔

اسی اثنا میں 15 جون کو پنڈت نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کو بذریعہ تار اطلاع کی کہ وہ شیخ عبداللہ کے مقدمے کی پیروی کے لیے سری نگر آنا چاہتے ہیں۔ مہاراجہ نے جواب دیا کہ اس مرحلے میں پنڈت نہرو کا کشمیر آنا حالات کو مزید خراب کر دے گا۔ مہاراجہ کی طرف سے عدم رضامندی کے باوجود پنڈت نہرو کشمیر جانے پر مصر رہے۔ گاندھی، سردار پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد سمیت بہت سے دوسرے کانگریسی راہنما نہرو کے کشمیر جانے کے پروگرام سے متفق نہیں تھے۔ ان راہنماؤں نے نہرو کو کشمیر جانے سے روکنے کی کوشش کی لیکن نہرو اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق 20 جون کو کانگریسی کارکنوں کے ہمراہ براستہ راولپنڈی کوہالہ پہنچ آئے۔ ان کے ہمراہ مسز آصف علی، دیوان چمن لعل اور مسٹر بلدیو سہائے بھی تھے جنہوں نے مقدمے کی پیروی کرنا تھی۔

حکومت کشمیر نے پنڈت نہرو اور ان کے قافلے کو روکنے کے لیے کوہالہ پل پر پولیس کی ایک چھوٹی سی پارٹی تعینات کر رکھی تھی۔ جموں اور سری نگر سے بھی حکومت کے حامیوں کے کچھ دستے یہاں پہنچ آئے تھے جنہوں نے کالی جھنڈیاں اٹھا رکھی تھیں اور ''پنڈت نہرو گو بیک'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان میں وادی سے میر واعظ مولانا یوسف شاہ کے حامیوں کا ایک دستہ اور پنڈت شیونرائن کی قیادت میں کشمیری پنڈتوں کا دستہ شامل تھا۔

پنڈت نہرو کا قافلہ جب ریاستی حدود میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو مظاہرین اور پولیس کے درمیان تصادم ہو گیا۔ اسی تصادم کے دوران پنڈت نہرو کی گاڑی ریاستی حدود میں داخل ہو گئی اور وہ دومیل تک آ پہنچے جبکہ قافلے کے جمِ غفیر کو پولیس نے روک لیا۔ گورنر کشمیر مہاراجہ کرشن در نے دومیل کے مقام پر پنڈت نہرو اور ان کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور دومیل کے ڈاک بنگلے میں رکھنے کے بعد اوڑی کے ڈاک بنگلے میں لا کر نظر بند کر دیا۔ ادھر پنڈت نہرو کی گرفتاری کی خبر ہندوستان کے اخبارات میں چھپی تو ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا اور کانگریسی حلقوں نے کشمیر حکومت کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔

حکومت کشمیر نے اسی روز اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے واضح کیا کہ پنڈت نہرو کو نظر بند رکھنا یا گرفتار کرنا حکومت کا مدعا نہیں محض حفاظتی تدابیر کے پیشِ نظر پنڈت جی کو اوڑی کے ڈاک بنگلے میں رکھا گیا ہے۔ وہ جب چاہیں واپس جا سکتے ہیں۔ اس غرض کے لیے حکومت نے سرکاری گاڑی بھی ڈاک بنگلے کے سامنے کھڑی کر دی لیکن پنڈت نہرو واپس جانے سے انکار کرتے رہے۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ سری نگر جا کر جیل میں شیخ عبداللہ سے ملاقات کریں گے۔ ادھر کانگریسی راہنماؤں کو جب اس صورتِ حال کی اطلاعات ملیں تو وہ سخت پریشان ہوئے مولانا

ابوالکلام آزاد صدر کانگریس نے تار کے ذریعے پنڈت نہرو کو واپس آنے کی استدعا کی دیگر کانگریسی لیڈروں نے بھی انہیں تار بھیجے اور ہندوستان میں درپیش معاملات کی سنگینی کے پیشِ نظر انہیں جلد واپس آجانے کی درخواست کی۔ چنانچہ کانگریسی راہنماؤں کے شدید اصرار پر پنڈت نہرو واپس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ وائسرائے لارڈ ویول نے خصوصی طیارہ بھیجا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اوڑی کے ڈاک بنگلے میں دو راتیں گذارنے کے بعد 22 جون کو طیارے کے ذریعے دہلی چلے گئے۔

مسلم لیگ اور قائداعظم کا ردِعمل:

آل انڈیا مسلم لیگ نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ مسلم کانفرنس اور اس کے لیڈروں کو بھی اس سے الگ رہنے کا مشورہ دیا۔

پروفیسر سرور عباسی لکھتے ہیں۔

''18 جون کو مسلم کانفرنس کے لیڈروں آغا شوکت علی اور خواجہ غلام محمد جیولر نے دہلی میں قائداعظم سے کشمیری صورتِ حال پر بات چیت کی۔ دو دن بعد انہی معاملات پر چوہدری غلام عباس نے بھی قائداعظم سے گفتگو کی۔ 21 جون کو مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں چوہدری صاحب نے اراکین عاملہ کو کشمیر کی صورت حال سے آگاہ کیا''۔

(پروفیسر سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 376)

چوہدری غلام عباس لکھتے ہیں۔

''چند دن بعد میں قائداعظم سے ملنے دہلی چلا گیا۔ وہ پہلے ہی اس تحریک کے خلاف تھے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے فرمایا کہ میں نے تمہارے ریزولیشن پڑھ لیے ہیں۔ بالکل مناسب اور بروقت ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے سیکرٹری مسٹر خورشید کے ذریعے اس تحریک کے خلاف ایک بیان بھی لکھوایا''۔

(چوہدری غلام عباسی ''کشمکش'' صفحہ 247)

قائداعظم نے کشمیر چھوڑ دو تحریک کے حوالے سے اخبارات کو ایک مفصل بیان جاری کیا۔ پروفیسر عباسی قائداعظم کے اس بیان کا حوالہ یوں دیتے ہیں۔

''مجھے افسوس ہے کہ بعض موقعوں پر طاقت کا بے جا استعمال کیا گیا اور ایسے حالات میں گولی چلائی گئی جب اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر زیادتی کے یہ واقعات صحیح ہیں تو میں ان کی مذمت کرتا ہوں ایسی صورت میں ضروری ہے کہ حکومتِ کشمیر ایک غیر جانبدار تحقیقاتی کمیشن مقرر کرے جو اس بغاوت کے اسباب وعلل کی جانچ پڑتال کرے اور یہ معلوم کرے کہ اس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں''۔

(پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 377)

ہندوستانی ذرائع ابلاغ کا کردار:

کشمیر چھوڑ دو تحریک کو شہرت و مقبولیت بخشنے میں ہندوستانی اخبارات و رسائل نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات نے لحہ بہ لحہ خبریں، تجزیے اور مراسلے شائع کیے۔ کئی اخبارات کے نمائندگان تحریک کی کوریج کے لیے خصوصی طور پر سری نگر گئے اور تواتر سے اخبارات کو مراسلات بھیجتے رہے۔ اخبارات نے خصوصی مضامین اور اداریے بھی لکھے۔ جن اخبارات و رسائل نے تسلسل سے اس تحریک کی کوریج کی ان میں لاہور، بمبئی اور دہلی کے اخبارات نمایاں رہے۔ یہ اخبارات و رسائل جب ذیل ہیں۔

ٹریبون (لاہور)	نوائے وقت (لاہور)	ڈان (دلی)	بمبئی سینٹی نل (بمبئی)
ہندوستان ٹائمز (دلی)	نیا زمانہ (بمبئی)	زمیندار (لاہور)	احسان (لاہور)
شہباز (لاہور)	پربھات (لاہور)	انصاری (دلی)	نیشنل ہیرالڈ (لکھنؤ)

کچھ اخبارات و رسائل نے اس تحریک کی مخالفت میں بھی جی بھر کر لکھا۔ ان میں امر (جموں) ہندوستان ٹائمز (دلی) امرت بازار پتریکا، ٹائمز آف انڈیا، ہندو، فری پریس جرنل وغیرہ نمایاں تھے۔

اس تحریک کو سب سے زیادہ حمایت لاہور کے مسلم اخبارات نے دی ان میں زمیندار، انقلاب، نوائے وقت اور احسان نے نمایاں کردار ادا کیا۔

کشمیر چھوڑ دو تحریک کی ہندوستان میں حمایت یا مخالفت کا یہ پہلو نہایت دلچسپ اور حیران کن ہے کہ مسلم لیگ نے اس تحریک کی مخالفت کی جب کہ مسلمانوں کے اخبارات و رسائل نے اس کی زبردست حمایت کی، ادھر کانگریس کے راہنما پنڈت نہرو نے اس کی حمایت کی جب کہ غیر مسلموں کے اخبارات اس کی مخالفت کی۔

مسلم کانفرنس اور دیگر ریاستی جماعتوں کا ردِعمل:

نیشنل کانفرنس نے جن دنوں کشمیر چھوڑ دو تحریک شروع کی اس وقت وادی کشمیر میں مسلم کانفرنس بہت کمزور ہو چکی تھی۔ مسلم کانفرنس کے راہنما میر واعظ مولانا یوسف شاہ کے پیروکار محلہ زینہ کدل تک محدود تھے لہٰذا مسلم کانفرنس اس تحریک کا توڑ کرنے یا اسے غیر موثر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ مسلم کانفرنس کے کچھ کارکن شروع میں تحریک کی حمایت بھی کرتے رہے کیونکہ وہ اس نعرے کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مسلم کانفرنس کے سرکردہ راہنما قریشی محمد یوسف نے اس تحریک کی حمایت کی تو چوہدری غلام عباس نے انہیں پارٹی رکنیت سے پانچ سال کے لیے خارج کر دیا۔ میر واعظ کے حامی صرف اتنا کر پائے کہ انہوں نے کوہالہ پر نہرو کو کشمیر میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی جو بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے دوسرے سرکردہ راہنما چونکہ جموں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ وادی سے اٹھنے والی اس تحریک کو روکنے یا غیر موثر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ شروع میں تو مسلم کانفرنس کے قائدین کو کچھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں کیونکہ نیشنل کانفرنس کی اس تحریک میں وہ نہ تو حصہ لے سکتے تھے اور نہ اس کی

مخالفت کے لیے حکومت کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس صورت حال میں مسلم کانفرنس کے رہنما چوہدری غلام عباس اور اے آر ساغر نے 27 مئی کو شملہ میں قائداعظم سے ملاقات کی اور ان سے ریاستی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ قائداعظم نے ان راہنماؤں کو مشورہ دیا کہ وہ اس تحریک سے الگ رہیں کیوں کہ شیخ عبداللہ نے یہ تحریک کانگریس کے ایماء پر شروع کی ہے۔ واپسی پر چوہدری غلام عباس نے لاہور سے بیان دیا۔

''یہ شورش کانگریسی نیتاؤں کے اشارے پر برپا کی گئی ہے اور اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ نیشنلسٹوں کی کھوئی ہوئی ساکھ کو بحال کیا جائے''۔

ان حالات میں مسلم کانفرنس نے 8-9 جون کو سری نگر میں میر واعظ مولانا یوسف شاہ کی صدارت میں ایک اجلاس طلب کیا جس میں مسلم کانفرنس کے تمام سرکردہ راہنما شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں چھ قراردادیں پاس کی گئیں۔ پہلی قرارداد میں مسلم کانفرنس نے ''فری کشمیر'' کو اپنا مطمع نظر قرار دیا۔ اور مہاراجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ موجودہ نظام کو ختم کر کے ''فری کشمیر'' کا قیام عمل میں لائیں جس میں ریاست کے تمام انسان برابر تصور کیے جائیں، ایک نیا آئین ساز ادارہ قائم کیا جائے جو ''فری کشمیر'' کے لیے آئین ترتیب دے۔ دوسری قرارداد میں ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کے بارے کوئی رائے دینے کے بجائے شیخ عبداللہ کو حدفِ تنقید بنایا گیا۔ بعدازاں 27 جولائی کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کا ایک اجلاس سری نگر میں چوہدری غلام عباس کی صدارت میں ہوا۔ اس وقت تک حکومت کشمیر چھوڑ دو تحریک پر مکمل قابو پا چکی تھی۔ اور تحریک کے سرکردہ راہنما اور بے شمار کارکن جیلوں میں بند تھے۔ اب مطلع صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس اجلاس میں مسلم کانفرنس نے کشمیر چھوڑ دو تحریک پر سخت تنقید کی، چوہدری غلام عباس نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''جب تک ہندوستان آزاد ہو اور انگریز وہاں سے چلے نہ جائیں معاہدات کی تنسیخ کی رٹ لگانا فضول ہے۔ کیونکہ قانوناً اس سودا بازی کی ثبت اور اہم ذمہ داری فروخت کنندوں پر آتی ہے۔''

(پروفیسر سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 378)

اے آر ساغر نے اعلان کرتے ہوئے کہا

''مسلم کانفرنس اب فری کشمیر کے سوال پر حکومت سے لڑائی لڑے گی۔ اب ہماری مکی زندگی کا دور ختم ہو چکا ہے اور مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم نے اب ہتھوڑا ہاتھ میں لینا ہے۔ اور ریاست کے چپے چپے پر آزادی کی جنگ لڑنی ہے''۔

(پروفیسر سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 381)

کشمیر چھوڑ دو تحریک میں مسلم کانفرنس سمیت ریاست کی دوسری جماعتوں نے جس ردعمل کا مظاہرہ کیا اس کا تجزیہ نامور صحافی اور تجزیہ نگار میر عبدالعزیز یوں کرتے ہیں۔

''کشمیر میں پانچ سیاسی پارٹیاں تھیں جو کہ مختلف وجوہ کی بنا پر شیخ محمد عبداللہ کی تحریک سے علیحدگی اختیار کر چکی تھیں اور اس کی مخالفت کرتی تھیں۔ پہلی جماعت کشمیر اور جموں کے فرقہ پرست ہندوؤں اور مہاراجہ کی قوم ڈوگروں کی جماعت تھی جو کہ ڈوگرہ راج کے خلاف کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ (یہ جماعت ہندو راجیا سبھا تھی)

دوسری جماعت کشمیری پنڈتوں کی تھی جو کہ شیخ عبداللہ کو بھی مسلم لیگی کہا کرتی تھی۔ (یہ جماعت کشمیری پنڈت کانفرنس تھی)

تیسری جماعت خود حکومت کشمیر اور اس کے کاسہ لیس غداروں کی تھی۔ (یہ جماعت آل جموں کشمیر سٹیٹ پیپلز کانفرنس تھی)

چوتھی جماعت مسلم کانفرنس تھی جو کہ شیخ عبداللہ کی کامیابی کو کانگریس کی کامیابی سمجھ کر اس کی تحریک سے کنارہ کش رہنا چاہتی تھی۔ اس جماعت کا خیال تھا کہ اگر ڈوگرہ راج کے بعد نیشنل کانفرنس کا کانگریسی راج قائم ہوا تو وہ بھی مسلمانوں کے لیے ایک بڑی مصیبت ہوگا۔

پانچویں جماعت کسان مزدور کانفرنس تھی۔ ان پارٹیوں کے لیڈروں کا خیال تھا کہ اول تو شیخ عبداللہ یا کانگریس درحقیقت مہاراجہ کو تخت سے اتارنا نہیں چاہتے اور اگر بفرضِ محال انہوں نے ایسا کیا بھی تو کشمیر میں ڈوگرہ راج کے بعد کانگریسی راج قائم ہو جائے گا جو کہ سرمایہ داروں اور فرقہ پرستوں کا راجیہ ہوگا۔ اس لیے ان پارٹیوں نے شدومد کے ساتھ شیخ عبداللہ کی مخالفت شروع کی۔'' (میر عبدالعزیز ''کشمیر کی تحریک آزادی'' صفحہ 65-66)

شیخ عبداللہ پر مقدمہ بغاوت:

شیخ عبداللہ نے 20 مئی کو گرفتاری سے قبل سری نگر میں عوامی اجتماعات کے سامنے جو تقاریر کیں ان میں نہایت بے باکیت اور باغیانہ لب و لہجہ تھا۔ ان تقاریر میں ڈوگرہ حکومت پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان کے اقتدار کو للکارا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ڈوگرہ مہاراجے اور اس کے نظام حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

"16 مئی کو شیخ عبداللہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہم سو سال بعد اس ڈوگرہ راج کو ختم کر کے رہیں گے۔ جنگ کا بگل بجا نہیں ہے کسی وقت بجے گا۔ اس شرمناک غداری کا انتقام لو۔ میں آج 1946ء میں اس شرمناک غداری کا انتقام مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں سے لوں گا۔''

("Kashmir on trial" صفحہ 18-19)

گرفتاری کے بعد شیخ عبداللہ کے خلاف مقدمہ بغاوت زیر دفعہ A-124 آئی پی سی بعدالت سیشن جج لالہ برکت رائے شروع ہوا۔ حکومت کی طرف سے اس مقدمے کی پیروی پنڈت مدسودھن کاک اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل اور دیگر وکلاء نے کی جبکہ شیخ عبداللہ کی طرف سے بھارت کے نامور وکیل مسٹر آصف علی، دیوان چمن لعل، جیا لعل

کلم اور دیگر وکلاء پیش ہوئے۔ حکومت کشمیر نے لاہور کے ایک وکیل مسٹر سیٹھی کی خدمات بھی حاصل کیں۔ شیخ کو بادامی باغ کے ملٹری ہسپتال میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس وزیر سروپ چند نے 28 مئی مقدمہ دائر کیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے پٹنہ کے ایک وکیل مسٹر سہائے کو بھی وکیل صفائی بنا کر بھیجا۔ اجتماعی طور پر آصف علی نے ہی وکیل صفائی کا سارا بوجھ برداشت کیا۔ دیگر وکلاء اُن کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ٹائپ کا سارا کام بیدی نے کیا۔ جو شیخ عبداللہ کے ایک دوست کی بیوی تھیں۔

24 جولائی کو جواہر لعل نہرو خود اس مقدمے کی پیروی کے لیے کشمیر آئے۔ اس بار حکومت کشمیر انہیں کی جرأت نہ کر سکی۔ وہ شیخ عبداللہ سے ملے اور ان کے گھر جا کر اہلِ خانہ سے بھی اظہار ہمدردی کیا۔ ایک روز گاؤن پہن کر عدالت کے کٹہرے میں بھی آ گئے اور وکلاء صفائی میں اپنا نام درج کروا دیا۔

دورانِ بحث وکلاء صفائی نے ''کشمیر چھوڑ دو'' کی عجیب و غریب تاویلیں پیش کیں جو سب خلاف حقیقت تھیں۔ شیخ عبداللہ نے بھی ایک مفصل بیان ریکارڈ کروایا۔ جس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان کی تحریک مقصد یہ نہیں تھا کہ مہاراجہ کشمیر چھوڑ دے۔ شیخ عبداللہ کا یہ موقف خلافِ حقیقت تھا۔ ان کی تقاریر کا عدالت میں پیش گیا سارا ریکارڈ اس امر کا گواہ تھا کہ ان کا اصل موقف کیا تھا۔

چنانچہ 10 ستمبر 1946ء کو عدالت نے تین تقریروں کی پاداش میں تین تین سال قید کی سزا اور روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ قید کی تینوں سزائیں بیک وقت شروع ہوئیں، اس طرح یہ سزا تین سال ہی بنتی تھی۔ نے اپنے فیصلے میں لکھا۔

''ملزم کا یہ اظہار کہ اس کی تقریروں کا مقصد حکمران کے زیرِ سایہ ذمہ دار نظام حکومت کا قیام ہے ریکارڈ پر مندرجہ حقائق سے ثابت نہیں ہوتا۔ بعد میں ٹھیک مشورے کے زیرِ اثر ملزم راہ راست پر آ گیا لیکن بہت دیر بعد اور اس وقت جب کے حالات خراب ہو چکے تھے۔ (پروفیسر سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی'' صفحہ 373)

بغاوت کے اس جرم کی پاداش میں شیخ عبداللہ 16 ماہ اور نو دن کی سزا کاٹ پائے تھے کہ بالآخر مہاراجہ کشمیر نے انہیں 29 ستمبر 1947ء کو اس وقت رہا کیا جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آ چکی تھی اور ریاست جموں بٹوارہ کرنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

کشمیر چھوڑ دو تحریک کی ناکامی کے اسباب

یہ حقیقت ہے کہ ''کشمیر چھوڑ دو تحریک'' اپنے مقاصد اور نتائج کے اعتبار سے نہایت بُری طرح ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس تحریک کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

غیر حقیقت پسندانہ موقف:

کشمیر چھوڑ دو تحریک کا بنیادی نقطہ نظر اور مطمع نظر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ تھا کہ شاہی خاندان جو

ایک صدی سے کشمیر پر حکومت کر رہا ہے وہ کشمیر کا اقتدار اعلیٰ چھوڑ کر کشمیر سے نکل جائے، یہ کسی اعتبار سے بھی جائز اور مناسب نہیں تھا۔ کشمیر میں رہنے کا جتنا حق شیخ عبداللہ یا کسی اور کا تھا اتنا ہی شاہی خاندان کے افراد کا بھی تھا کیونکہ وہ بھی اس ریاست کے رہنے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ سری نگر اور اس کے مضافات سے باہر نہ نکل سکا۔ بلا تمیز مذہب و ملت ریاست کی غالب اکثریت نے اس نعرے کا ساتھ نہ دیا۔ شیخ عبداللہ کے اس موقف کا پردہ اس وقت چاک ہوا جب عدالت میں شیخ عبداللہ کی وہ تقاریر پیش کی گئیں۔ جن میں شیخ عبداللہ نے شاہی خاندان کو [illegible] باتیں کہتے ہوئے انہیں کشمیر سے نکل جانے کو کہا تھا لیکن جب ان تقاریر پر جرح ہوئی تو شیخ اور اس کے وکلاء نے پینترا بدلتے ہوئے کہا کہ ''ہمارا مطلب کچھ اور تھا''۔ شیخ عبداللہ کا معاہدہ امرتسر کو بیع نامہ قرار دے کر اس کی مذمت کرنا بھی سراسر غلط تھا کیونکہ معاہدہ امرتسر دوررس سیاسی نتائج کا حامل معاہدہ تھا جس کی اپنی تاریخی اہمیت تھی، اسی معاہدے کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کو ایک علیحدہ تشخص ملا تھا۔ (معاہدہ امرتسر کی تفصیلات اس کتاب کے علیحدہ باب میں ملاحظہ فرمائیں)

جماعتی پالیسی کا فقدان:

یہ تحریک جماعتی پالیسی یا موقف کے بالکل برعکس شروع کی گئی تھی اس سلسلے میں جماعتی قیادت اور کارکنوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کے کارکن اس تحریک کو چند روز سے آگے نہ بڑھا سکے اور وہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر خاموش ہو گئے۔ اس ضمن میں پنڈت پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں۔

''کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے کشمیری پنڈت رکن کشپ بندھو نے اپنے اخبار ہفت روزہ ''دیش'' میں نہایت افسوس کے ساتھ شکایت کی کہ ''یہ تحریک شروع کرنے سے پہلے سب سے بڑے لیڈر نے مجلسِ عاملہ سے مشورہ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا''۔

(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''تاریخ جدوجہدِ آزادی کشمیر'' اردو ترجمہ، عبدالحمید نظامی، صفحہ 264)

محمد فاروق رحمانی نیشنل کانفرنس کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد سعید مسعودی کی رائے یوں بیان کرتے ہیں۔

''کشمیر چھوڑ دو تحریک'' کا ذکر کرتے ہوئے آج سے کئی برس پہلے گاندربل میں مولانا مسعودی نے مجھے بتایا کہ اس تحریک کے بارے میں جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے کوئی علم نہ تھا اور پارٹی کی مجلسِ عاملہ میں بھی اس پر غور و فکر نہیں ہوا تھا''۔

(محمد فاروق رحمانی ''شیخ عبداللہ کے نقوش'')

تحریکِ حریت کشمیر کے مصنف رشید تاثیر نے لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ نے لاہور سے ایک مراسلے کے ذریعے اپنے اس ارادے سے سری نگر میں اپنے ہیڈ کوارٹر مجاہد منزل کو آگاہ کیا تھا۔

ناقص حکمتِ عملی:

کشمیر چھوڑ دو تحریک کسی ٹھوس منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی کے بغیر شروع کی گئی تھی۔ لاہور سے وزارتی مشن

کو یادداشت بھیج کر شیخ عبداللہ سری نگر آئے تو آناً فاناً نہایت جذباتی تقاریر شروع کر دیں۔ تین تقاریر کرنے کے بعد وہ براستہ مظفر آباد ریاست سے بھاگ رہے تھے کہ انہیں گڑھی دوپٹہ کے قریب گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک شروع کرتے ہی تحریک کے بانی کا ریاست سے نکل جانا ناقص حکمتِ عملی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

ثنااللہ بٹ اس کا تجزیہ یوں کرتے ہیں۔

''شیخ عبداللہ کی سری نگر سے راولپنڈی کے لیے اچانک روانگی کے بارے میں خود شیخ صاحب نے آج تک کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ کشمیر میں اس نئی تحریک کے آغاز ہی میں باہر کیوں جا رہے تھے۔ البتہ سیاسی حلقوں میں دو قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اس مطالبے کے حق میں ہندوستان کی رائے عامہ کو اپنا ہموا بنانے کے لیے کشمیر سے باہر جا رہے تھے اور دوسری یہ کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے ریاست سے باہر رہنا چاہتے تھے۔

(ثناءاللہ بٹ ''کشمیر 1947ء سے 1977 تک'' صفحہ نمبر 23)

شیخ عبداللہ کی ناقص حکمتِ عملی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جس شدومد اور جذباتی انداز میں ڈوگرہ حکمران کو ریاست سے بزور طاقت نکال باہر کرنے کی دھمکیاں شیخ عبداللہ نے اپنی تقاریر میں دی تھیں۔ ان دھمکیوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ حکومت کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کرنے کے نتیجے میں حکومت نے جو طاقت استعمال کی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی حکمتِ عملی پیشِ نظر نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک چند روزہ مزاحمت کے بعد دب کر رہ گئی۔

کیمونسٹوں کی کارفرمائی:

یہ امر واقع ہے کہ ''کشمیر چھوڑ دو تحریک'' شیخ عبداللہ نے لاہور کے اپنے چند کیمونسٹ دوستوں کے مشورے سے شروع کی تھی۔ بمبئی میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے شیخ عبداللہ کو ملاقات کا وقت نہ دیا تو واپسی پر ان کے کیمونسٹ دوستوں مسٹر بیدی، ڈاکٹر اشرف اور ایم ڈی تاثیر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ مہاراجہ کو سبق سکھانے اور اسے بدنام کرنے کے لیے اسے کشمیر سے نکالنے کی تحریک شروع کریں۔ چنانچہ شیخ کے انہی انقلابی دوستوں نے اُسے کیبنٹ مشن کے لیے میمورنڈم تیار کر کے دیا۔ جس عرصے میں شیخ عبداللہ نے یہ تحریک شروع کی اس عرصے میں وہ کیمونسٹ تحریک سے کافی متاثر تھے اور کیمونزم کو ہی وہ اپنا مطمع نظر بنائے ہوئے تھے۔ کشمیر چھوڑ دو کے دوران مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے ایک دوست وکٹر کو خط لکھا جس میں شیخ عبداللہ کو کیمونسٹ اور ملک دشمن قرار دیا گیا۔ (مہاراجہ ہری سنگھ کے خط کا عکس مضمون کے آخر پر ملاحظہ فرمائیں)

مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری غلام عباس اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

''شیخ صاحب کے کیمونسٹ دوست جن میں مسٹر بیدی، ڈاکٹر اشرف اور تاثیر مرحوم پیش پیش تھے شیخ صاحب کا یہ انجام گوارہ نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے لیے ''کشمیر چھوڑ دو'' کا نعرہ تجویز کیا''۔
(چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' صفحہ 236)

کیمونسٹوں کے اشتعال کے سبب شروع کی گئی یہ تحریک ریاستی عوام کے لیے قابلِ قبول نہ ہو سکی۔

دوغلی پالیسی:

کشمیر چھوڑ دو تحریک شیخ عبداللہ کی دوغلی پالیسی کا منہ بولتا ثبوت تھا کیونکہ شیخ عبداللہ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ مہاراجہ کے زیرِ سایہ ذمہ دار نظامِ حکومت کا مطالبہ کرتے رہے۔ 1944 میں انہوں نے نیا کشمیر کا میمورنڈم جاری کیا اور 1946ء میں یکایک مہاراجہ کو کشمیر سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ اس تحریک سے شیخ عبداللہ کی دوغلی پالیسی کا دوسرا بڑا ثبوت یہ سامنے آیا کہ وہ مسلم لیگ یا قائداعظم کے کشمیر میں آنے کو تو بیرونی مداخلت قرار دے کر رد کرتے رہے لیکن کیمونسٹوں یا نہرو کی کشمیر کے معاملات میں مداخلت کو خوش آمدید کہتے رہے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نیشنل کانفرنس کی دوغلی پالیسی کی مثال یوں دیتے ہیں۔

''بخشی غلام محمد نے جو ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک جاری ہونے سے پہلے ہی ریاست سے کھسک گیا تھا۔ دہلی پہنچ کر جون کے اوائل میں کانگریسی راہنماؤں کے کہنے پر یہ بیان دیا ''نیشنل کانفرنس نے ریاست میں ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا ہے اور یہ جماعت حکمران خاندان کو کسی قسم کا گزند پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی''۔
(پنڈت پریم ناتھ بزاز ''تاریخ جدوجہدِ آزادی کشمیر'' اردو ترجمہ عبدالحمید نظامی، صفحہ 267)

نیشنل کانفرنس ایسی مبہم اور دوغلی پالیسیوں کے سبب عوام کا اعتماد کھو چکی تھی۔ اسی لیے عوام نے اس تحریک میں سری نگر کے علاوہ کہیں سے اس کی حمایت نہ کی۔

کانگریس کی مداخلت:

کشمیر چھوڑ دو تحریک میں کانگریس کی کھلم کھلا مداخلت اور نہرو کی سرِ عام حمایت نے کشمیری عوام کی نظروں میں اس تحریک کو مشکوک بنا دیا۔ اس تحریک کی آڑ میں شیخ عبداللہ نے کشمیر کے معاملات میں کانگریس کی مداخلت کے لیے دروازہ کھول دیا۔ کانگریس کی اس بے جا مداخلت کو دیکھتے ہوئے بھی کشمیری عوام اس تحریک سے لاتعلق ہو گئے۔

فاروق رحمانی اس ضمن میں یوں تجزیہ کرتے ہیں۔

''مہاراجہ ہری سنگھ کے موروثی شخصی نظام کے خلاف شیخ عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کی جدوجہد میں اُس وقت تک کوئی قباحت دریافت نہیں ہوئی تھی جب تک بظاہر یہ جدوجہد کسی بیرونی طاقت کے اثر سے آزاد اور پاک تھی۔ لیکن شیخ عبداللہ کی تمام تر جدوجہد اس وقت مشکوک اور لاحاصل بن جاتی ہے۔ جب یہی شخص جموں کے ایک ہندو مہاراجے کے بعد کشمیریوں کو ایک زیادہ قوی ملک کی یلغار کے حوالے کر دیتا ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک مقامی ہندو راجے کو کشمیری مسلمانوں کی بھاری اکثریت پر حکومت کرنے کا کوئی جواز نہ تھا تو ایک بہت بڑی ہندو مملکتی طاقت کو کشمیر میں دعوت دینے میں اہلِ کشمیر کا کیا مفاد تھا.....؟ شیخ عبداللہ نے ایک گرتے اور بھاگتے ہندو خاندان کے بدلے کشمیریوں پر ایک اُبھرتی ہوئی ہندو طاقت مسلط کر کے اپنی جدوجہد اور ''کشمیر

چھوڑ دو" نعرے کو مشکوک اور بے اعتبار بنایا کیونکہ ڈوگرہ مہاراجہ کے بھاگ جانے کے بعد اُس کا بیٹا دہلی کے کانگریسی نظام کے تحت ہمارا صدرِ ریاست بنایا گیا۔ اور ہندوستان کے برہمن نظام نے اپنی پوری مملکتی قوت کے ساتھ کشمیری مسلمانوں کی قومی زندگی کے تمام شعبوں میں وہی رول اختیار کیا جو اس سے پہلے ہندوستان میں برطانوی سامراج نے سنبھالا تھا۔ اس تجربے کی روشنی میں ہمیں شیخ عبداللہ کے نعرے میں جو بظاہر اچھا تھا بدنیتی اور دیانتداری کی کوئی رمق تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔ اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ آنے والے دور کے مورخ اور لوگ شیخ عبداللہ کو کشمیر کے حُریت پسندوں کی صف میں جگہ دینے سے صاف انکار کریں گے"۔

(محمد فاروق رحمانی "شیخ عبداللہ کے نقوش" صفحہ 70-64)

O

مہاراجہ ہری سنگھ کا خط

AIR MAIL



My dear Victor,

You have, no doubt, read in the papers about the trouble in Kashmir but it is not a thousandth part of what interested parties make it appear to be in the Press. The trouble started with the local demagogue, Abdullah, who is frankly communist and anti-State, suddenly discovering that he could not with impunity carry out his policy of disrupting the Government from within through the agency of his friend who had been appointed Minister, while simultaneously battering the Government from outside by making inflammatory speeches and levelling baseless accusations. Naturally my Government had to take action and took it, with the result that Abdullah and a number of his little friends were arrested. At the time of his arrest Abdullah was apparently on his way to see his Guru Jawaharlal and so Jawaharlal's personal vanity was greatly injured by the fact that his Lieutenant was arrested when on his way to take sanctuary with him. Being what he is, Jawaharlal has completely gone off the deep end.

Except for a day or two after Abdullah's arrest life here has been normal and everybody goes about his business. In one quarter of the town between the 3rd and the 4th bridges a Mosque has been converted into a political stage and two or three thousand people including women collect there daily ostensibly for prayers but in reality to keep the show of agitation alive by making inflammatory speeches and using objectionable slogans. We are keeping our end up well and no one interested in us need feel any anxiety The movement was, of course, very dangerous but we have weathered the storm. In fact, our main headache now is hostile and baseless criticism from Jawaharlal, but even his ranting must have a limit. In any case we are prepared for anything he may say or do - and we think he knows it - in fact in the end he may feel that discretion is the better part of valour and shut up, anyway we will fight and fight to an end. This is a test case for all the States.

I am posting this letter to your Rangoon address and should it reach you, do let me know how long you propose to be in Burma.

We are expecting Tiger for his summer vacations on the 18th.

With kindest regards from us all.

Yours sincerely,

[signature]

Srinagar,
1st June. 1946.

11

آزاد کشمیر میں آئین سازی کے ارتقائی مراحل

پسِ منظر:

جدید ریاست جموں کشمیر میں آئین سازی کا عمل تحریکِ حریتِ کشمیر کے نتیجے میں معرضِ عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں 1931ء کا سال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال پے در پے کچھ ایسے المناک واقعات پیش آئے جن کے نتیجے میں ریاست بھر کے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔ اس سے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں زبردست ارتعاش پیدا ہوا۔ مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے جلسے جلوسوں اور مظاہروں کا ایسا سلسلہ شروع کیا جس نے ایک طرف نظامِ حکومت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور دوسری طرف والئی ریاست مہاراجہ ہری سنگھ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر نظامِ سلطنت چلانا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ اس نے رعایا عوام کی شکایات و مسائل کا جائزہ لینے اور ان کے تحفظات کے تجزیے کیلئے ایک انگریز آفیسر مسٹر بی جے گلانسی کی سربراہی میں ''گلانسی کمیشن'' کا قیام عمل میں لایا۔ اس کمیشن نے چند ماہ کی محنت شاقہ کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ کو ایک سو صفحات پر مشتمل مفصل رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ریاست جموں کشمیر میں ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی (تفصیلات اسی کتاب کے علیحدہ باب میں ملاحظہ فرمائیں)۔

اس کمیشن کی سفارشات کی منظوری دیتے ہوئے مہاراجہ ہری سنگھ نے سر برجور لال (چیف جسٹس ہائی کورٹ) کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی قائم کی جسے ''فرنچائز کمیٹی'' کا نام دیا گیا۔ اس کمیٹی نے آئین ساز اسمبلی کا ڈھانچہ ترتیب دیا۔

ڈوگرہ عہدِ حکومت میں گلانسی کمیشن کا قیام اور فرنچائز کمیٹی کی تشکیل ریاستی آئین سازی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہی کاوشوں کے نتیجے میں 1934ء کو ریاست میں پہلی قانون ساز اسمبلی کا قیام عمل میں آیا۔ برطانوی ہند کی شخصی ریاستوں میں ریاست جموں کشمیر تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ریاست نہ صرف رقبے کے اعتبار سے سب ریاستوں سے بڑی تھی بلکہ 1934ء میں قانون ساز اسمبلی کا قیام عمل میں آنے سے بھی اس ریاست کو 565 شخصی ریاستوں میں انفرادی مقام حاصل تھا۔

فرنچائز کمیٹی نے جو آئینی ڈھانچہ ترتیب دیا اس کے نتیجے میں 75 ممبران اسمبلی پر مشتمل ''جموں کشمیر پرجا سبھا'' کا قیام عمل میں لایا گیا جسکے 1934ء میں پہلی بار اور 1938ء میں دوسری بار انتخابات عمل میں لائے گئے۔

ریاست جموں کشمیر کا پہلا باضابطہ آئین

ریاست جموں کشمیر کا پہلا باضابطہ اور جامع آئین دسمبر 1939ء بمطابق 22 بھادوں 1996 بکری کو نافذ کیا گیا۔ آئین کو ''Jammu & Kashmir Constitution Act 1996'' کا نام دیا گیا۔ اس آئین کی تیاری میں ریاست کے ممتاز ماہرین قانون نے حصہ لیا۔ الٰہ آباد کے مشہور قانون ساز سر تیج بہادر سپرو جو مہاراجہ کے قانونی مشیر بھی تھے نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ آئین 78 دفعات اور بہت سی ذیلی دفعات پر مشتمل تھا۔ ریاستی قانون ساز اسمبلی (جموں کشمیر پرجا سبھا) کے ممبران کی تعداد 75 رکھی گئی۔ وزیراعظم اور اس کے وزراء کی کونسل اس پرجا سبھا کے ممبران میں سے مہاراجہ خود نامزد کرتا۔ اسمبلی کے صدر کا انتخاب بھی مہاراجہ خود کرتا۔ البتہ نائب صدر کا انتخاب ممبران کرتے۔ پرجا سبھا کے ممبران کی تعداد 75 تھی۔ اس آئین کے تحت ان میں سے 33 ممبران براہ راست ووٹوں کے ذریعے منتخب ہو کر آتے۔ 7 ممبران خصوصی نشستوں سے منتخب ہوئے، بقیہ 35 ممبران مہاراجہ اپنی صوابدید پر نامزد کرتا۔ اسمبلی کی میعاد تین سال رکھی گئی۔ آئین کی دفعہ 5 کے تحت اقتدارِ اعلیٰ کا مالک مہاراجہ ہری سنگھ تھا، جو کوئی بھی قانون نافذ کر سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو دفعہ 5۔

5. "His Highness, inherent powers. Notwithstanding anything contained in this or any other Act, all powers, legislative, executive and judicial, in relation to the State and its government are hereby declared to be and to have always been inherent in and possessed and retained by His Highness and nothing contained in this or any other Act shall affect or be deemed to have affected the right and prerogative of His Highness to make laws, and issue proclamations, orders and ordinances by virtue of his inherent authority. "

(Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir. ApendixII P14

آئین کی دفعہ 24 کے تحت ریاستی اسمبلی کو کچھ مخصوص معاملات میں قانون سازی کا اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو دفعہ 24۔

"It shall not be lawful for the Praja Sabha to consider or deal with any matter or enact any law relating to or affecting.

(a) His Highness or any member of the royal family or the management of the royal household.

(b) Relations, treaties, conventions or agreements between the State and His Majesty the King Emperor of India or the Government of India or with foreign powers or the Government of any State in India now subsisting or in force or hereafter to be established or made;

(c) Matters of Frontier Policy including those relating to Ladakh and Gilgit;

(d) Such matters relating to the Jagirs of Poonch and Chenani as

His Highness may specif y;

Rights specifically granted to Illaqadars or Jagirdars by their sanads:

(e) The organization, discipline and control of the State forces:

(f) The departments declared by His Highness for time to time as Hazur departments:

(g) The Dharm arth Trust:

(h) The provisions of this Act and the rules made there under and their repeal or modification; and

(i) Such other matters as may be specified by His Highness from time to time".

(Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir.(ApendixII P-21 (Jammu and Kashmir Constitution Act 1996, B)

اس ایکٹ کے تحت ہائی کورٹ کو وہی درجہ دیا گیا تھا جو قبل ازیں 1985 بکرمی ایکٹ کے تحت اُسے حاصل تھا۔

آزاد کشمیر میں آئینی ارتقاء

1947ء میں جب ریاست جموں کشمیر کو جبراً تقسیم کرکے اس پر بھارت اور پاکستان نے قبضہ کر لیا تو آئینی و ریاستی نظام بھی ختم ہو گیا جو ڈوگرہ عہد میں نافذ العمل تھا۔ اُس وقت ریاست متحدہ شکل میں 84,471 مربع میل پر مشتمل تھی۔ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ریاست کا بادشاہ تھا۔ ریاست میں آئین سازی کے زیادہ اختیارات بادشاہ کو حاصل تھے۔ تاہم ایک آئین ساز ادارہ 1934ء سے قائم تھا۔ جس میں ساری ریاست جموں کشمیر کے تمام طبقات و علاقہ جات کی نمائندگی موجود تھی۔ اس اسمبلی کے اختیارات اگرچہ محدود تھے تاہم یہ متحدہ ریاست جموں کشمیر کی نمائندہ اسمبلی ضرور تھی اور اسے ریاست کے عزت و وقار کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تقسیم ریاست سے پہلے اس اسمبلی کے تین بار (1947,1938,1934) انتخابات ہو چکے تھے (تفصیلات اس کتاب کے علیحدہ باب میں ملاحظہ کریں)۔

1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف بغاوت، کے نتیجے میں تقریباً ایک تہائی حصہ ڈوگرہ کنٹرول سے نکل گیا تو یہاں ایک باغی حکومت قائم کی گئی۔ اس حکومت کے قیام کا اعلان 4 اکتوبر 1947ء کو ہوا اور پھر اس کی تشکیل نو 24 اکتوبر 1947ء کو عمل میں لائی گئی۔ اس حکومت کی ہیئت ایک وار کونسل کی تھی، جس کے پیشِ نظر آئین سازی یا قانون سازی جیسے معاملات نہ تھے بلکہ اس کا واضح مقصد یہ تھا کہ یہ حکومت جہاد فی سبیل اللہ اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے ساری ریاست جموں کشمیر کی آزادی کے لئے ضروری اقدامات عمل میں لائے گی۔

جسٹس منظور الحسن گیلانی لکھتے ہیں۔

"The people of the State rose in revolt against the ruler, and liberated this part of the State, which is known as Azad State of Jammu & Kashmir and established the Azad Government on 24th October, 1947. This Government initially started as War Council, as its sole aim was concentration upon liberation of the entire State. "

(جسٹس منظور الحسن گیلانی *"Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir". P-vi,vii*)

یکم جنوری 1949ء کو حکومتِ پاکستان اور حکومتِ انڈیا کے مابین جنگ بندی کا معاہدہ طے پانے کے بعد آزاد کشمیر نے اپنی ساری توجہ اس خطے کے انتظامی معاملات کی طرف مرکوز کر لی۔ جسٹس محمد یوسف صراف ان [illegible] کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"When the Azad Kashmir Government was formed on the 24th of October, 1947, no constitutional apparatus was in existence. It was a Presidential form of government but the President enjoyed undefined and unlimited powers. He was the fountain of all authority, although nominally, he was answerable to the WC of the Muslim Conference. When in March 1948, Ch. Ghulam Abbas Khan came from occupied Kashmir and was appointed Supreme Head of the Government, the position remained the same except that instead of one, there were now tow kings in one kingdom, with the obvious results. "

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 1367)

آزاد کشمیر کی واحد سیاسی جماعت مسلم کانفرنس نے اپنی ساری توجہ ریاست جموں کشمیر کے اس ساڑھے چار [illegible] مربع میل علاقے کی حکمرانی پر مرکوز کر دی۔ چنانچہ حکومتی معاملات کو چلانے کے لئے باقاعدہ ایک نظامِ حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی۔

رولز آف بزنس 1950ء

آزاد کشمیر کیلئے پہلے رولز آف بزنس کے نفاذ کا حکم آزاد کشمیر کے سپریم ہیڈ چوہدری غلام عباس نے مری کے [illegible] 28-12-50 کو جاری کیا۔ ان رولز کو Rules of Business for Azad Kashmir Govt. کا [illegible] گیا۔ یہ رولز 31 دفعات اور 4 شیڈولز پر مشتمل تھے۔ یہ رولز 15 جنوری 1951ء کو صدرِ آزاد کشمیر [illegible] یوسف شاہ کے دستخطوں سے نافذ العمل ہوئے۔ رولز میں سپریم ہیڈ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی۔

"Supreme Head" means Supreme Head of Azad Kashmir Movement ان رولز کے تحت [illegible] وسیع اختیارات حاصل تھے۔ سپریم ہیڈ کو تحریک آزادی کا سربراہ قرار دیتے ہوئے آزاد کشمیر کے صدر اور وزراء کی [illegible] اختیارات سے دیا گیا۔ وزراء کی کونسل بھی سپریم ہیڈ کے سامنے جوابدہ بنادی گئی۔ سپریم ہیڈ کو انتظامی و پالیسی معاملات میں [illegible] وزراء کی کونسل کو اس طرح کی ہدایات جاری کرنے کے اختیارات دیئے گئے۔ آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے ججز کی تقرری [illegible] کے اختیار میں دے دی گئی۔ اس سے قبل مقرر کردہ ججوں کی تقرریاں انہی رولز کے تابع بنادی گئیں۔ پبلک سروس [illegible] کے چیئرمین اور ممبرز کی تقرریوں کا اختیار بھی سپریم ہیڈ کو دیا گیا۔

قانون سازی کے اختیارات کونسل کو دیئے گئے۔ ان رولز کے تحت عدلیہ اور انتظامیہ کا ایک نظام وضع کیا [illegible] بعد ازاں ترامیم بھی عمل میں لائی جاتی رہیں۔

ان رولز کے تحت ایک 'چیف ایڈمنسٹریٹر ایڈوائزر' کا ایک عہدہ بھی تخلیق کیا گیا۔ مشیر اعلیٰ کے اس عہدے
نے رولز آف بزنس کی آئینی روح کو بری طرح متاثر کیا۔ خواجہ غلام احمد پنڈت ان رولز میں مشیر اعلیٰ کے عہدے
تخلیق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ نظام ایک نقطہ نظر سے اپنی موجودہ ہیت وحالات میں قابلِ قبول تھا، لیکن انتظامیہ میں ایک ''ہر مختار'' عہدے
یعنی مشیر اعلیٰ کی تخلیق نے پورے رولز آف بزنس ہی کو ایک طرفہ تماشا بنا کر رکھ دیا، جو کئی برس تک تنقید کا نشانہ بنا رہا اور ایک
اچھے بھلے کاز کو آزاد کشمیر کے اندر اور باہر مضحکہ خیز بنا دیا''۔

بقول شاعر: راہنما اُٹھے تھے حلِ مسئلہ کے واسطے — اور حلِ مسئلہ خود مسئلہ ثابت ہوا

(خواجہ غلام احمد پنڈت ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' صفحہ 265)

رولز آف بزنس 1952ء

22 جون 1952 کو کرنل شیر احمد خان کو آزاد کشمیر کا صدر بنایا گیا۔ اس حکومت میں پانچ وزراء پر مشتمل کیبنٹ بنائی گئی
وزراء چوہدری غلام عباس کے نامزد کردہ تھے۔ حکومت پاکستان یا وزارتِ امور کشمیر کی ہدایت پر اس حکومت نے
اکتوبر 1952ء کو نئے رولز آف بزنس بنائے، جنھیں آزاد کشمیر کیلئے آئین کے مترادف قرار دیا گیا۔ یہ رولز آف بزنس
27 دفعات، بہت سی ذیلی دفعات اور تین شیڈولز پر مشتمل تھے۔ ان نئے رولز کے تحت سپریم ہیڈ کا عہدہ ختم کر دیا
رولز کی دفعہ 21 کے تحت وزارتِ امورِ کشمیر کو آزاد کشمیر کے معاملات میں حصہ دار بنا دیا گیا۔ ملاحظہ ہو دفعہ 21

21: The Ministry of Kashmir Affairs shall exercise general supervision over the services with a view to ensuring that Government employees discharge their duties properly.

(جسٹس منظور الحسن گیلانی Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir Appendix IV P-82

رولز کی دفعہ 5 A.Z کے تحت صدر آزاد کشمیر کا عہدہ مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کے تابع خوشنودی کر دیا
گیا۔ ملاحظہ ہو دفعہ 5:

"The President shall hold office during the pleasure of General Council of the All Jammu and Kashmir Conference, duly recognized as such by the Government of Pakistan and the Ministry of Kashmir Affairs".

(جسٹس منظور الحسن گیلانی Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir Appendix IV P-78

چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ مذکورہ رولز آف بزنس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب کرنل شیر احمد خان کی حکومت بن گئی تو حکومت پاکستان یا وزارتِ امور کشمیر کے اشاروں پر آزاد کشمیر میں
رولز آف بزنس بنائے گئے، جو در اصل آزاد کشمیر کے آئین کے مترادف تھے اور یہ رولز آئین نہ تھے بلکہ ان رولز
نے حکومت آزاد کشمیر کو وزارتِ امورِ کشمیر کی داشتہ بنا دیا''۔

(چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ ''جموں کشمیر کی جنگ آزادی کی کہانی تاریخ کی زبانی'' صفحہ 504)

جسٹس منظور الحسن گیلانی ان رولز کے اثرات ونتائج کا جائزہ یوں پیش کرتے ہیں:

"The position of Azad Jammu and Kashmir Government was ridiculous under this document. The powers under this Constitutional document practically vested in a "Joint Secretary Ministry of Kashmir Affairs", but were expressed in the name of President, who could hold office during the pleasure of General Council of All Jammu and Kashmir Muslim Conference, duly recognized as such, by the Government of Pakistan in the Ministry of Kashmir Affairs. The President was aided by a Council of Ministers. The phrase "duly recognized in the Ministry of Kashmir Affairs" created mischief and unrest in the smooth running of the Government "

(جسٹس منظور الحسن گیلانی *(Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir: P-vii*

حصولِ اقتدار کی رسہ کشی میں مسلم کانفرنس تین دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ غلام عباس گروپ، ابراہیم خان گروپ اور میر واعظ یوسف شاہ گروپ، کانفرنس کے اس اندرونی خلفشار کے سبب کشمیری قیادت وزارتِ امورِ کشمیر کے قدموں پر جا پہنچی۔ وزارت کے اس کردار کا جائزہ جسٹس محمد یوسف صراف یوں پیش کرتے ہیں:

"What is worth nothing is that the M.K.A was treated as something independent of the Pakistan Government because it did not even trust the Government of Pakistan as represented by the Prime Minister, in so far as A.K matters were concerned! Brigadier Bashir Malik Secretary M.K.A in 19 77 frankly admitted in a conversation that the Ministry was based on a concept of mistrust. The second point to be noted is that actually there never existed a General Council since 1942 when the party was revived, to say the least, of one enjoying the privilege of recognition by the Ministry. No draft legislation could even be put before the Council of Ministers without obtaining the advice of the Ministry of Kashmir Affairs and incase of difference of opinion between itself and the M.K.A, the AJK Government could not give effect to its own point of view without further prior consultation with the said Ministry· "

نہ تڑپنے کی اجازت نہ ہی فریاد کی ہے — گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 1367-68)

رولز آف بزنس 1958ء

29 نومبر 1958ء کو سابقہ رولز آف بزنس کو کالعدم قرار دے کر نئے رولز آف بزنس نافذ کیے گئے۔ یہ رولز ... دفعات، بہت سی ذیلی دفعات اور چار شیڈولز پر مشتمل تھے۔ ان کا اجراء صدر آزاد کشمیر سردار محمد ابراہیم خان کے

دستخطوں سے ہوا۔ان رولز کی دفعہ 21 کے تحت وزارتِ امورِ کشمیر کو حکومت آزاد کشمیر پر عملاً فوقیت دے دی گئی۔
کو اب نہ صرف ملازمین پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی بلکہ حکومتی معاملات کی نگرانی اور انتظامی امور میں
ہدایات جاری کرنیکی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ رولز کی دفعہ 21 ملاحظہ فرمائیں:

21: "The Ministry of Kashmir Affairs shall have general supervision over the Azad Kashmir Government in matters of policy and general administration."

(جسٹس منظور الحسن گیلانی Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir.Appendix V P-18)

منظور الحسن گیلانی مذکورہ رولز کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The Rules were again superseded in 1958, and new rules were enforced, (Appendix V), where under a "Chief Adviser" was substituted instead of "Joint Secretary". All functions of Government were exercised in the name of the President, but real power vested in the "Chief Adviser" or any other officer nominated by the Ministry of Kashmir Affairs. The Ministry had general supervision over the Azad State in matters of policy and general administration. The Government of Azad Jammu and Kashmir could not create a post carrying pay exceeding Rs. 150/- or enter into an expenditure exceeding rupees one lac per annum.

(جسٹس منظور الحسن گیلانی Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir. P-vii, viii)

ان رولز کے نتیجے میں اندرونِ ریاست اور بیرونِ ریاست حکومت آزاد کشمیر کا وقار بہت حد تک گر گیا۔
حکومت وزارتِ امورِ کشمیر کی لونڈی بن کر رہ گئی۔ خوجہ غلام احمد پنڈت اس صورتحال کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ اس محدود دائرہ اختیار و عمل میں آزاد کشمیر کا وجود سلامتی کونسل یا بیرونی ممالک کی نظر میں ایک غیر نمائندہ، بے وقعت اور ناقابلِ التفات بن کر رہ گیا۔ جس وزارت کو آزاد کشمیر میں ممد و معاون ہونا چاہیے تھا نہ معلوم کیوں اسکی حریف بن گئی اور بے بصیرتی و بے تدبیری کا یہ عالم کہ اس حکومت کو جو مدعی اور کشمیری حریت پسندوں کی آواز تھی، اُسے سلامتی کونسل یا دوسرے عالمی فورم میں اپنی زبان سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنیکا موقع نہیں دیا گیا''۔ (خواجہ غلام احمد پنڈت ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' صفحہ 265-66)

ایکٹ 1960ء

وزارتِ امورِ کشمیر نے وقتاً فوقتاً آزاد کشمیر میں اپنی طرف سے نافذ کردہ رولز آف بزنس کا سہارا لیکر
حکومتیں بنانے اور توڑنے کا جو طریقہ کار رائج کیا یہ ہرگز جمہوری روایات اور عوامی نمائندگی کا آئینہ دار نہیں تھا
میں خطے کے عوام کے جذبات، احساسات، خیالات اور پروگرام کی ترجمانی تھی۔ چنانچہ انہی رولز کے تحت
پاکستان نے 1959ء کو صدر آزاد کشمیر سردار محمد ابراہیم خان کو صدارت سے الگ کر کے مسٹر کے ایچ خورشید کو صدر
کیا۔ کے ایچ خورشید کی تربیت ایک مخصوص سیاسی و جمہوری ماحول میں ہوئی تھی۔ اُنہوں نے آزاد کشمیر کے

دیگر معاملات میں وزارتِ امورِ کشمیر کے بیجا اور شرمناک کردار کو دیکھتے ہوئے اسے یکسر بدلنے اور حکومتِ آزاد کشمیر
کو باوقار، نمائندہ اور جمہوری روایات کا آئینہ دار بنانے کے لئے مروجہ نظام کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے پاکستان کی
طرز پر آزاد کشمیر میں بھی بنیادی جمہوری نظام (بی ڈی سسٹم) رائج کرنیکا عزم کیا۔ بالآخر مسٹر کے ایچ خورشید کی کاوشوں
سے رولز آف بزنس 1958ء میں ترمیم کرتے ہوئے آزاد کشمیر میں ''آزاد جموں کشمیر بیسک ڈیموکریٹک ایکٹ 1960ء
نافذ کیا گیا۔

صدر آزاد کشمیر کے ایچ خورشید نے 16 ستمبر 1960ء کو مظفر آباد میں ایک پریس کانفرنس میں بنیادی
جمہوری نظام کے نفاذ کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

''مجھے یقین ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کا نظام رائج کرنے سے قوم نئے جوش وولولے سے کام شروع کرے گی،
ریاست کی سیاسی زندگی میں انقلاب آجائے گا اور آزادی کی تحریک اور آزادی کے لئے جنگ کو تقویت ملے
گی''۔ (کے ایچ خورشید کا پریس کانفرنس سے خطاب ہفت روزہ ''آزاد کشمیر'' مظفر آباد 23 ستمبر 1960ء)

چنانچہ بی ڈی سسٹم کے تحت 20 نومبر 1960ء کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر 2400 لوکل کونسلرز کے چناؤ
کیلیے انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں ووٹرز نے 1200 کونسلرز آزاد کشمیر سے چنے اور 1200 کونسلرز مہاجرین
کشمیر مقیم پاکستان سے چنے گئے۔ آزاد کشمیر کی تاریخ میں یہ پہلے انتخابات تھے، ان انتخابات کے نتیجے میں جو 2400
کونسلرز چنے گئے، اُنہوں نے بعد ازاں جمہوری طریقہ کار کے تحت 17 اکتوبر 1961ء کو صدر آزاد کشمیر کا چناؤ عمل میں
لایا۔ ان صدارتی انتخابات میں چھ اُمیدواروں نے حصہ لیا۔ ان میں کے ایچ خورشید (صدر آزاد کشمیر)، سردار عبدالقیوم
خان، پیر علی جان شاہ، خواجہ غلام نبی گلکار، چوہدری سلطان علی اور مسٹر محمد داؤد شامل تھے۔ مسٹر کے ایچ خورشید نے 949
ووٹ لیکر باقی اُمیدواروں پر برتری حاصل کی۔ چنانچہ وہ آزاد کشمیر کے پہلے منتخب صدر قرار پائے۔

ایکٹ 1960ء کے تحت بنیادی جمہوری نظام (Basic Democracy System) کے نفاذ سے
آزاد کشمیر ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ آزاد کشمیر میں ووٹنگ کے نظام نے عوام کو جمہوری اندازِ فکر دیا اور اُنہیں کاروبارِ
حکومت میں حصہ لینے اور اس پر اثر انداز ہونے کے مواقع مہیا کیے۔

ایکٹ 1964ء

1964ء میں ایک نیا ایکٹ نافذ کیا گیا۔ سٹیٹ کونسل کے ممبران کی تعداد 24 سے گھٹا کر آٹھ کردی گئی اور یہ
ممبران صرف آزاد کشمیر سے لیے جانے طے پایا۔ بعد میں مہاجرین سے بھی دو ممبران لئے گئے۔ یوں چھ ممبرز آزاد کشمیر
اور دو مہاجرین مقیم پاکستان سے لئے گئے۔ سٹیٹ کونسل کے ان ممبران کو ایکٹ 1960ء کے تحت یونین کونسلوں، ٹاؤن
کمیٹیوں کے ممبرز منتخب کرتے تھے۔ مشیر اعلیٰ ان ممبران میں سے کسی ایک آدمی کو کونسل کا چیئرمین منتخب کرتا تھا۔ اس
چیئرمین نے بلحاظ عہدہ آزاد کشمیر کا صدر منتخب ہونا تھا۔ مشیر اعلیٰ کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ وہ سٹیٹ کونسل کے باہر سے
کسی ریاستی باشندے کو صدر نامزد کرے۔ باہر سے نامزد ہونیکی صورت میں اس شخص کو اپنے تقرر کے چھ ماہ کے اندر

سٹیٹ کونسل سے اعتماد کا ووٹ لینا ضروری قرار دیا گیا۔ کے ایچ خورشید کی صدارت سے برطرفی کے بعد چیف آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خان عبدالحمید خان کو صدر نامزد کیا گیا۔ لہٰذا اُنھوں نے قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سٹیٹ کونسل سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔

ایکٹ 1964ء کیخلاف آزاد کشمیر میں سخت بے چینی پیدا ہوگئی، چنانچہ سیاسی وسماجی حلقوں نے اس ایکٹ کو جمہوریت کی روح کے منافی قرار دیتے ہوئے اسے واپس لینے کا مطالبہ شروع کر دیا۔

جسٹس یوسف صراف لکھتے ہیں:

"Then came the 1964 Act which was a humiliating document. The State Council could not undertake any legislation without the previous consent of the Chief Adviser. Even this was not considered enough because it also provided that no law could take effect unless the Chief Adviser directed so by a Notification. He was also empowered to restrict its application to any part of the territory and make any changes he liked! The Secretary General was designated as Senior Secretary and the IGP as Director of Police. The six members of the State Council elected from Azad Kashmir in 1961 were constituted as State Council, which now existed on paper. "

(*Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 1369)

ایکٹ 1968ء

17 ستمبر 1968ء کو آزاد کشمیر میں نظامِ حکومت چلانے کے لئے ایک نیا ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے چیف ایڈوائزر کو مہاجرین مقیم پاکستان سے چار نمائندے کونسل میں نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا۔ یوں سٹیٹ کونسل کے ممبران کی تعداد 12 کر دی گئی۔ اس سٹیٹ کونسل کو محدود سطح پر قانون سازی کے اختیارات بھی دیے گئے۔

جسٹس محمد یوسف صراف لکھتے ہیں:

"In 1968, a new Act known as the Government Act of 1968 was enforced. The above provisions with regard to legislative limitations and nomenclature of Senior Secretary and the Director of Police were retained. It now provided for the setting up of a new State Council consisting of 12 members, with the following distribution:

Azad Kashmir	8 seats
Jammu refugees	2 seats &
Kashmir refugees	2 seats

Thus restoring the refugees representation, though reducing it from ½ to 1/3rd. the members from Azad Kashmir were to be elected by Basic Democrats while the refugees were to be nominated by the Chief Adviser, on the recommendation of the Azad Kashmir President. One of

the members was to be elected as Chairman of the Council, who was also to function as ex-officio President of Azad Kashmir. "

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 1369)

آزاد کشمیر کے انتظامی معاملات میں وزارتِ امورِ کشمیر کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ نے حکومتِ آزاد کشمیر کو ایک کھلونا بنا کر رکھ دیا۔ آزاد حکومت جو ساری ریاست کی نمائندہ، جمہوری اور عوامی خواہشات کی ترجمان حکومت ہونا چاہیے تھی، اسے وزارت کے کلرکوں نے Local Authority کا نام دیا اور پھر اس کی حیثیت کو نت نئے رولز پامال کر کے خاک میں ملا دیا۔

خواجہ غلام احمد پنڈت لکھتے ہیں:

"اسلامی کونسل نے اگر آزاد کشمیر حکومت کو "لوکل اتھارٹی" کہا تو وزارتِ امورِ کشمیر کے بعض بزرجمہروں نے اسی لہجے سے آزاد کشمیر کی پٹائی شروع کر دی اور گھسیٹتے گھسیٹتے اسے ڈسٹرکٹ بورڈ یا میونسپل کمیٹی کے درجے پر پہنچا دیا.......اس طرح ہمارے دوستوں نے ہماری بھی لٹیا ڈبودی اور اپنے پاؤں پر بھی کلہاڑا چلا دیا"۔

(خواجہ غلام احمد پنڈت "کشمیر آزادی کی دہلیز پر" صفحہ 266)

وزارتِ امورِ کشمیر کے سازشی افسروں نے آزاد کشمیر کے پہلے منتخب صدر مسٹر کے ایچ خورشید کے جمہوری اور انقلابی اقدامات سے خائف ہو کر جب اُنہیں صدارت سے ہٹا دیا تو ایک سرکاری ملازم خان عبدالحمید خان کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کر دیا۔ اس تبدیلی سے آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت میں سخت مایوسی پیدا ہوئی۔ اس نفرت اور بے چینی کے ماحول میں جب 1968ء کے رولز لاگو کیے گئے تو ان رولز کے غیر جمہوری، غیر منصفانہ اور تحریک آزادیٔ کشمیر کے سراسر منافی ہونے کے سبب آزاد کشمیر کی جمہوریت پسند اور آزادی پسند جماعتوں نے ان کیخلاف زبردست تحریک شروع کی۔

جسٹس محمد یوسف صراف لکھتے ہیں:

"Demonstration s were held at Rawalpindi and Karachi for the repeal of the 1968 Act. In Karachi an All-Parties Kashmir Committee took out a procession on 5th December 1968, led by Mr. Amanullah Khan of the Plebiscite Front, Mr. Mumtaz Abbasi of Albara and Kh. Ghulam Hassan Punjabi of the Liberation League.

In Muzaffarabad a violent demonstration was staged outside the office of the President demanding its forthwith repeal. In consequence, three workers of the Liberation League. Kh. Ghulam Nabi Pandit, Kh. Abdul Khalique Dar and Kh. Ghulam Muhammad Lala were arrested on 1st January 1969 and banished for a month to 7000ft. high Leepa valley, which was reached by crossing, on foot. 11500ft. high snow-decked Birthwar pass. "

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 70-1369)

ایکٹ 1970ء

ایکٹ 1968ء کو منسوخ کر کے آزاد کشمیر میں ایک جمہوری، ذمہ دار اور تحریک آزادی کشمیر کی علم بردار حکومت قائم کرنے کے لئے لبریشن لیگ، محاذ رائے شماری اور دیگر سیاسی جماعتوں نے اہم کردار ادا کیا۔

جسٹس محمد یوسف صراف اس سلسلے میں سیاسی جماعتوں اور قائدین کی کاوشوں کی تفصیلات یوں بیان کرتے ہیں:

"Leders of three political parties, Sardar Qaiyum, Mr. Khurshid and Sardar Ibrahim signed a joint declaration in Rawalpindi on 5th Augut, 1968. They decided to appoint a joint standing committee for execution and coordination of the joint programme. They addressed a press conference on the same day and released a four point declaration, reiterating faith in the indivisibility of the Jammu and Kashmir State and the solution of Kashmir problem through a plebiscite. It asked for a Constitution, providing effective representation to all elements of the State and pledged supports to any movement that may be launched by the leaders of occupied Kashmir for liberation. It also demanded in point No. 3 (a) that the reconstituted Azad Kashmir Government be treated as full sovereign government, successor to the Government of Maharaja Hari Singh for a whole State. They addressed a reception given by the Joint Standing Committee at the Rawalpindi Press Club on 18th August. The declaration was ondorsed by their respective Working Committees. They set up a joint Steering Committee consisting of Kh. Abdus Samad Wani, Sardar Rehmatullah, Pir Ali Jan Shah, Mr. Amin Mukhtar, Kh. Manzoorul Haq Dar, Raja Muhammad Aslam, Ch. Hussain Ali, Ghulam Rasool Baig, Sh. Khalid Mahmud,

Ch. Khadim Hussain and Sardar Latif Khan, to workout details and sponsor joint action. Mr. Musa Ahmed, a Bengali, married to the daughter of Khawaja Shahabuddin, who was Chief Adviser, was sympathetic. Late Lt. General Akbar then a Major General and Head of the Intelligence Directorate who hailed from Mirpur, was also helpful. A discreet attempt was made by some elements to exclude Refugees on the political plane but the Foreign Office, aware of its grave implications, strongly advised against. Major General Akbar who was earlier in favour of the move, promptly withdrew his support and fell in line with the Foreign office view.

While Sardar Ibrahim and smaller groups here and there, like the Kisan Mazdoor Conference led by Kh. Abdus Salam Yatu and Mr. Muhammad Amin Haider were, from time to time, voicing demands for an elected representative government, the leading faction led by Ch.

Ghulam Abbas Khan was opposed to the creation of an elected Assembly, largely on the plea that AK was a transitory phase. I think that the principal reason of opposition by him was the fear that it may ultimately weaken the commitment of the A.K inhabitants to the Cause of liberation as the bone of power may derail some of its politicians. It may be said in fairness to the departed leader who died of cancer on the 18th of December 1968 that his fears were not unfounded. "

(جسٹس محمد یوسف صراف *Kashmiri's Fight for Freedom* جلد دوم صفحہ 1370-71)

آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں کی زبردست جدوجہد کے نتیجے میں صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان نے آزاد کشمیر میں قانون ساز اسمبلی کے قیام کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ چنانچہ خان عبدالحمید کو کرسی صدارت سے الگ کر کے 8 نومبر 1969ء کو بریگیڈیر عبدالرحمان خان کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کیا گیا اور انہیں آزاد کشمیر کے لئے ایک نئے آئین کی تیاری اور اس کے تحت صدارتی انتخابات عمل میں لانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

جسٹس محمد یوسف صراف نے اس ایکٹ کا ڈرافٹ تیار کیا، وہ اس کی تفصیلات یوں بیان کرتے ہیں:

"It was in these circumstances that Brigadier Abdul Rehman took oath of office in November 1969. His first task was to give Azad Kashmir a Constitution and in our first meeting, I offered to produce a draft. Within two weeks I placed it in his hand and sent a copy to Sardar Abdur Rashid, Minister Kashmir Affairs. When the Constitution was a t last promulgated in September as the Government Act of 1970, it was a matter of personal satisfaction to find that over 70% of my draft had been incorporated in the Act including thenumber of seats and their distribution not only vis-à-vis Azad Kashmir and refugees but also with regard to theirallocation to the threedistricts of Azad Kashmir. The procedure suggested by me for a 'no-confidence' motion against the President hadalso been accepted which was a special feature of the Constitution as no such Provision exists in Presidential form of Governments. "

(جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد دوم صفحہ 1371)

ایکٹ 1970ء کے تحت صدر آزاد کشمیر کا چناؤ براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کیا گیا۔ ایک قانون ساز اسمبلی قائم کی گئی جس کے ممبران کی تعداد 25 رکھی گئی۔ 24 ممبران اسمبلی کا انتخاب بھی براہ راست ووٹوں کے ذریعے عمل میں لایا گیا۔ ایک خاتون ممبر اسمبلی کا انتخاب بذریعہ ممبران اسمبلی ہوا۔ اسمبلی کی معیاد چار سال رکھی گئی۔ اس ایکٹ میں پہلی بار Plebiscite Advisor کا عہدہ رکھا گیا۔ قانون سازی کے اختیارات قانون ساز اسمبلی کو تفویض کیے گئے۔ صدر، ممبر قانون ساز اسمبلی اور ووٹرز کیلئے اہلیت کا تعین کیا گیا۔ یہ ایکٹ 38 دفعات اور بہت سی ذیلی دفعات پر مشتمل تھا۔

شریف طارق ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

''اس آئین کا نفاذ جنرل یحییٰ کے دور میں ہوا۔ دراصل آزاد کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار ایک آئین کا نفاذ کیا گیا جس میں عوام کو براہ راست ووٹ دینے کا حق ملا اور عوام نے جمہوریت کی طرف ایک قدم اٹھایا۔ آزاد کشمیر میں رٹ کا حق بھی اس آئین کے تحت ملا''۔ (چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ ''زندگی جہد مسلسل'' صفحہ 143)

ایکٹ 1970ء کے اثرات و نتائج پر بحث کرتے ہوئے خواجہ غلام احمد پنڈت لکھتے ہیں:

''آزاد کشمیر گورنمنٹ ایکٹ 1970ء معرض وجود میں آیا، جو سالہا سال کے بعد اسکی تاریخ میں ایک بنیادی انقلاب لایا اور پہلی بار آزاد کشمیر کے سیاسی نظام کو ایک میونسپل کمیٹی کی پستی سے اٹھا کر ذمہ دار نظام حکومت کی بلندی پر پہنچا دیا''۔ (خواجہ غلام احمد پنڈت ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' صفحہ 325)

ایکٹ 1970ء کا نفاذ آزاد کشمیر کی آئینی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ منظور الحسن گیلانی اس ایکٹ کے ثمرات کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

"The major, significant and far-reaching change in the Constitutional frame-work of Azad State came into being in 1970 through Azad Jammu & Kashmir Government Act, 1970. A complete democratic setup was introduced through the Act, where under a Legislative Assembly and President for Azad Jammu & Kashmir State were elected, on the basis of adult franchise, by the people of Azad Jammu & Kashmir and the refugees of Jammu & Kashmir settled in Pakistan. Assembly consisted of twenty four members elected directly on the basis of adult franchise and one co-opted ladv member.

Act 1970 introduced a democratic form of Govt. through Presidential system. President was the Chief Executive of the Azad Jammu & Kashmir, while all legislative powers vested in the Assembly. Except defense, security, current coin and responsibilities of Government of Pakistan under UNCIP Resolutions, the Assembly could make laws on all the subjects and the executive authority of the Government extended to all the matters on which the Assembly had the power to make laws."

(جسٹس منظور الحسن گیلانی *"Constitutional Development in Azad Jammu Kashmir" P-ix,x*

ایکٹ 1970ء کے تحت 30 اکتوبر 1970ء کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں سردار عبدالقیوم خان، کے ایچ خورشید، سردار محمد ابراہیم خان اور چوہدری شریف طارق ایڈووکیٹ نے بطور اُمیدوار حصہ لیا۔ چنانچہ سردار عبدالقیوم خان حکومت پاکستان، فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی بھرپور معاونت سے 2,29,512 ووٹ حاصل کر کے بازی لے گئے۔

عبوری ایکٹ 1974ء

1973ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں پاکستان میں حقیقی معنوں میں ایک جمہوری اور پارلیمانی آئین نافذ کیا گیا، جسے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ چنانچہ آزاد کشمیر میں بھی ایک جمہوری اور پارلیمانی طرز حکومت کے رجحان کو تقویت ملی۔ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں نے بھی پاکستان کے آئین کی طرز پر ایک نئے آئین کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں نومبر 1973ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو آزاد کشمیر کے دورے پر آئے اور انہوں نے آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کا عندیہ ظاہر کیا۔ ان کا یہ عندیہ سامنے آتے ہی آزاد کشمیر میں تمام سیاسی جماعتوں نے اسکی بھرپور مخالفت شروع کر دی۔ خصوصاً آزادی پسند جماعتوں نے اس کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کی اور آزاد کشمیر کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ ''بچہ بچہ کٹ مرے گا، کشمیر صوبہ نہیں بنے گا''۔ کشمیری عوام کے غیض و غضب اور جوش وجذبے کو دیکھتے ہوئے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کے بجائے اسے ایک نیا نظام حکومت دینے کا فیصلہ کیا۔

10 جون 1974ء کو آزاد کشمیر کی اہم سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی صدارت میں ہوا، جس میں آزاد کشمیر کے لئے نئے آئین پر اتفاق رائے کیا گیا۔ وفاقی وزیر قانون مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے ایک پریس کانفرنس میں آزاد کشمیر کیلئے نئے آئین کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اس پریس کانفرنس میں آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان، سردار ابراہیم خان، چوہدری نور حسین، مسٹر کے ایچ خورشید، پیر علی جان شاہ، میر واعظ محمد احمد اور مسٹر یوسف بچھ (مشیر وزیر اعظم پاکستان) شامل تھے۔

ایکٹ 1974ء کے نمایاں خط وخال

ایکٹ 1974ء کے نمایاں خط وخال حسب ذیل ہیں:

1. آزاد کشمیر میں صدارتی نظام کے بجائے ''پارلیمانی نظام'' رائج کیا گیا ہے۔
2. وزیر اعظم کا انتخاب سادہ اکثریت سے ممبران اسمبلی کرتے ہیں اور وہ آزاد کشمیر کا چیف ایگزیکٹو بھی ہوتا ہے۔ وزیر اعظم بلحاظ عہدہ کشمیر کونسل کا بھی ممبر ہوتا ہے۔
3. صدر کا انتخاب ممبران اسمبلی دو تہائی اکثریت سے کرتے ہیں۔ صدر سربراہ ریاست کہلاتا ہے۔
4. صدر کی غیر حاضری میں سپیکر قانون ساز اسمبلی قائمقام صدر کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔
5. وزیر اعظم کی غیر موجودگی میں کابینہ کا سینئر وزیر وزیر اعظم کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔
6. ''جموں و کشمیر کونسل'' کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، جسے مقننہ کے اختیارات حاصل ہیں۔ ان اختیارات کی

وضاحت مذکورہ ایکٹ کی دفعہ 21 میں کی گئی ہے۔

۷۔ کشمیر کونسل کا چیئرمین، چیف ایگزیکٹیو پاکستان بلحاظ عہدہ ہوتا ہے۔ جبکہ وائس چیئرمین صدر آزاد کشمیر بلحاظ عہدہ ہوتا ہے۔

۸۔ چیئرمین اور وائس چیئرمین سمیت کونسل کے ممبران کی تعداد 14 ہوتی ہے، جن میں سے 6 ممبران حکومتِ پاکستان کے نمائندے ہوتے ہیں اور 8 حکومتِ آزاد کشمیر کے۔

۹۔ آئین سازی کیلئے مشترکہ اجلاس (Joint Sitting) کا طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے، جس کی رو سے کونسل اور قانون ساز اسمبلی مل کر ہی آئین سازی کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ آزاد کشمیر اسمبلی کی معیاد پانچ سال مقرر کی گئی ہے۔

۱۱۔ قانون ساز اسمبلی آزاد کشمیر کے ممبران کی تعداد 49 رکھی گئی ہے، ان میں سے 29 ممبران براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزاد کشمیر کے 29 حلقہ ہائے انتخاب سے منتخب ہوتے ہیں۔ 12 نشستیں مہاجرین کشمیر مقیم پاکستان کیلئے رکھی گئیں ہیں۔ 6 نشستیں صوبہ جموں کے مہاجرین کیلئے اور چھ [illegible] کے مہاجرین کے لئے۔ یہ ممبران بھی انتخابات کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں۔ بقیہ آٹھ سیٹیں مختص ہیں [illegible] نشستیں خواتین کیلئے، ایک نشست علماء ومشائخ کیلئے، ایک نشست تارکین وطن کیلئے اور ایک نشست [illegible] کریٹس کے لئے۔ ان آٹھ نشستوں کا انتخاب ممبران اسمبلی کرتے ہیں۔ اسمبلی ممبران کے لئے عمر کی حد 25 سال رکھی گئی ہے۔ جبکہ ووٹرز کیلئے یہ حد 21 سال ہے۔

۱۲۔ ایکٹ کی دفعہ 56 کے تحت حکومتِ پاکستان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی نوعیت کے پیش نظر حکومت آزاد کشمیر کو برخاست کر سکتی ہے۔

عبوری آئین سازی کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے سال 1974ء میں حکومت پاکستان نے ایک مسودہ آئین مرتب کر کے آزاد کشمیر اسمبلی میں منظوری کیلئے پیش کیا جسے "Interim Constitution Act 1974" کا [illegible] دیا گیا۔ ایکٹ 1974ء حقیقی معنوں میں کوئی نئی آئین سازی نہ تھی اور نہ ہی آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبران کو اس سے انکار کسی ترمیم کا حق حاصل تھا بلکہ حکومتِ پاکستان کے اُس اختیار کا اطلاق تھا جس کا سلامتی کونسل کی قراردادوں سے [illegible] کیے جانے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سلامتی کونسل سے اس نوع کی کوئی قراردادیں ہوئیں اور نہ ہی اس طرح کے کوئی اختیارات حکومتِ پاکستان کو حاصل تھے۔

آئین کے ابتدائیہ سے ہی یہ عیاں ہوتا ہے کہ مسودہ آئین آزاد کشمیر کی محض رسمی منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ ایکٹ 1974ء کے ایکٹ 1970ء کے ساتھ تقابلی جائزہ سے بادی النظر میں ہی واضح ہو جاتا ہے کہ ان ایکٹوں

میں کوئی بڑا تضاد نہ ہے۔ تاہم ایکٹ 1974ء صریحاً اور واضح طور پر باہم متضاد ہے۔ اس تضاد کا جائزہ لینے کیلئے سرسری طور پر سلامتی کونسل کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد میں پاکستان کے اختیارات سے متعلق دفعات کا جائزہ لینا ضروری ہے اور پھر انہی اختیارات کا ایکٹ 1974ء کی دیگر دفعات کے ساتھ تقابل کرنا ضروری امر ہے۔ مذکورہ قرارداد سلامتی کونسل کا حصہ دوم، الف پاکستان کے اختیارات وفرائض سے متعلق ہے۔

حصہ دوم، الف ملاحظہ فرمائیں

(الف)

"(۱) چونکہ ریاست جموں کشمیر میں پاکستانی فوج کی موجودگی اس صورتِ حالات میں نمایاں تبدیلی کے مترادف ہے جو اس نے سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس لیے حکومتِ پاکستان ریاست سے اپنی فوجوں کو واپس بلانے پر رضامند ہے۔

(۲) حکومتِ پاکستان اس امر کی پوری کوشش کرے گی کہ ریاست جموں کشمیر سے قبائلی اور پاکستانی باشندے جو وہاں پر رہائش نہیں رکھتے ہیں اور لڑائی کی خاطر ریاست میں داخل ہوئے ہیں، ریاست سے واپس چلے جائیں۔

(۳) جس علاقہ سے پاکستانی فوج کی واپسی عمل میں آجائے گی اس کا نظم ونسق قطعی فیصلہ تک مقامی حکام کے سپرد اور کمیشن کی نگرانی میں ہوگا۔"

حکومتِ پاکستان نے متعدد بار اپنے ملک میں مروجہ نظام کی اساس پر آزاد کشمیر میں بھی حکومت سازی کے لئے آئین بنائے، ترمیم کیے، بگاڑے اور یکسر ختم کر کے نئے سرے سے نافذ کیے۔ تاہم ایکٹ 1974ء کی رو سے 13 اگست 1948ء کی قرارداد کی دھجیاں بذریعہ دفعہ 4 ذیلی دفعہ 4 کلاز 7 بکھیر دی گئیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے 13 اگست 1948ء کی قرارداد میں کشمیری عوام کو رائے کے حق کے استعمال کی مکمل آزادی دی گئی کہ وہ جو چاہیں بلا کسی تعصب اور امتیاز کے نظریے کا پرچار کر سکتے ہیں۔ مزید برآں الحاق کے مسئلہ پر بھی اُن کو ووٹ کا حق دیا گیا، لیکن قدغن ہرگز نہ لگایا گیا کہ وہ بہر صورت الحاق ہی کریں۔ ملاحظہ فرمائیں مذکورہ بالا قرارداد کا حصہ سوئم

حصہ سوئم

حکومتِ ہندوستان اور حکومتِ پاکستان اپنی اس خواہش کا اعادہ کرتی ہیں کہ ریاست جموں کشمیر کی آئندہ حیثیت عوام کی خواہشات کے مطابق متعین کی جائے گی اور اس مقصد کے لیے، جنگی سمجھوتہ کو قبول کر لینے کے بعد، دونوں حکومتیں کمیشن کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہیں تاکہ ایسی منصفانہ شرائط طے کی جا سکیں جن کے تحت ایسی آزادانہ رائے کا اظہار یقینی ہو۔

سلامتی کونسل کی قرارداد مذکورہ سے اخذ کردہ اس حق کو دفعہ 4 مندرجہ بالا کی رو سے یوں معدوم کر دیا گیا۔

Section: 0 4 (3) (7) (2)No person or political party in Azad Jammu & Kashmir shall be permitted to propagate against or take part in activities prejudicial or detrimental

- ☆ The ideology of the accession
- ☆ Pakistan

گویا حقِ الحاق کو پاکستان کے ساتھ مشروط کر کے سلامتی کونسل کی قراردادوں سے صریحاً انحراف کیا گیا۔

ایکٹ 1974ء کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ ایکٹ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور حقوقِ انسانی کے اُن تمام مسلّمہ اصولوں کے متصادم ہے جن کی رو سے کشمیری عوام کو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ یہ ایکٹ کشمیری عوام کو یا حکومتِ آزاد کشمیر کو کسی ایسی سرگرمی کی اجازت نہیں دیتا جس کا مقصد ریاست جموں کشمیر کے عوام کو حقِ خود ارادیت یا حقِ آزادی سے ہمکنار کرنا ہو۔ نظریۂ الحاقِ پاکستان پر یقین اور ایمان کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس نظریے کے منافی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے، صدر، وزیرِ اعظم، ممبران، عدلیہ کے ججز اور تمام سرکاری ملازمین کے لیے الحاقِ پاکستان کی سوچ پر کاربند رہنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

ایکٹ 1974ء کے تحت پارلیمانی طرز کا جو نظام متعارف کروایا گیا ہے اُس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پارلیمانی کا ایک حصہ آزاد کشمیر کی اسمبلی کی صورت میں بمقام مظفرآباد ایک صدر، ایک وزیرِ اعظم، اراکین قانون ساز اسمبلی، سپریم کورٹ، ہائی کوٹ اور دوسرے اداروں کی صورت میں معرضِ وجود میں لایا گیا۔ جوڈیشل بورڈ کا نام تبدیل کر کے سپریم کورٹ رکھا گیا۔ جبکہ پارلیمان کا دوسرا حصہ کشمیر کونسل کی صورت میں معرضِ وجود میں لایا گیا، جس کا سربراہ پاکستان کا مقتدرِ اعلیٰ تجویز ہوا۔ اگر پاکستان کا مقتدرِ اعلیٰ منتخب نمائندہ ہے تو جمہوریت کے بروئے اور اگر مارشل لاء والا ہے، تو وردی اور جمہوریت دونوں یعنی ایک وقت میں دہری تفریح مارشل لاء بھی اور جمہوریت بھی، (Military Democracy)۔ یہ ایک کراماتی نظام ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی دیگر خطے میں نہیں ملتی۔ بلکہ نوآبادیاتی نظام کو چلانے کے سلسلہ میں اسی نوع کی قانون سازی بھی کسی دیگر نوآبادیاتی نظام کے مقابلہ میں ممتاز ہے۔ اسمبلی کو قانون سازی کی بابت محدود اختیارات ہیں جبکہ کونسل کے اختیارات لامحدود اور وسیع ہیں۔ کشمیریوں کو اپنی آزادی کے سلسلہ میں کسی قانون سازی کا حق حاصل نہ ہے، حق محض پاکستان کے مقتدرِ اعلیٰ کو دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک تضحیک آمیز قانون سازی کی گئی جس کی رو سے اسمبلی اور کشمیر کونسل دونوں کو قانون سازی کے حق سے روک دیا گیا۔ ملاحظہ ہو دفعہ 31 ذیلی دفعہ 3۔

Neither the council nor the assembly shall have the power to make any law concerning

a) The responsibilities of Govt. or Pakistan under the UNCIP resolutions.
b) The defence and security of Azad Jammu and Kashmir;

(c) The current coin or the issue of any bills, notes or other paper currency; or

(d) The external affairs of Azad Jammu and Kashmir including foreign trade and foreign aid.

دلچسپ بات یہ ہے کہ UNCIP کمیشن کی کوئی قرارداد سرے سے موجود ہی نہ ہے۔ اوّلاً تو قرارداد صادر کرنے کا حق یا تو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کو ہے یا سلامتی کونسل کو ہے۔ کسی کمیشن کو سرے سے کوئی حق حاصل ہی نہ ہے۔ چلیئے اگر مان بھی لیا جائے کہ کمیشن کو کوئی حق حاصل تھا تو بھی کمیشن نے ہندوستان اور پاکستان کی حکومت ہا کو محض تجاویز دی ہیں نہ کہ کوئی قرارداد صادر کی ہے۔ یوں کشمیری عوام کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ کرنے کا حق بروئے ایکٹ 1974ء محض پاکستان کا حق بنا دیا گیا۔

اس نوع کی ایک غاصبانہ کڑی دفعہ 33 ہے جس کی رو سے آئین میں بعض اہم نوعیت کا ترامیم کا حق کشمیری عوام سے چھین لیا گیا۔ ملاحظہ ہو دفعہ 33 ذیلی دفعہ 1:

The provisions of this act may be amended in accordance with the following provisions. Provided that no amendment shall be made in section 31, this section or section 56 saves with the prior approval of the govt. of Pakistan.

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ترمیم کی نسبت حکومتِ پاکستان سے قبل از ترمیم کس طرح اجازت لی جائے، اس کا طریقۂ کار ایکٹ 1974ء میں موجود نہ ہے۔ یوں کشمیری عوام کا حقِ آزادی اس ایکٹ کی رو سے مکمل طور پر قانون سازی کے ذریعے ختم کر دیا گیا اور اسی پر بس نہیں بلکہ یہ حسن کرشمہ سازی کی کرامت کہ کس حکومت کو چلنے دیا جائے اور کس کی چھٹی کر دی جائے۔ یہ حق بھی کشمیری عوام کو نہ دیا گیا۔ اگر غور سے ایکٹ کا ملاحظہ کیا جائے تو سارا ایکٹ اور قانون سازی محض ایک ڈھونگ اور دھوکہ سازی ہے۔ بروئے دفعہ 56 حکومتِ پاکستان نے یہ حق محفوظ کر لیا کہ وہ کسی بھی منتخب نمائندہ حکومت کو بدوں نوٹس چلتا کر دے۔ ملاحظہ ہو دفعہ 56:

Act not to derogate from the responsibilities of Pakistan: -

Nothing in this act shall derogate from the responsibilities of govt. of Pakistan in relation to the matters specified in sub-section 3 of section 31 or prevent the govt. of Pakistan from taking such action as it may consider necessary or expedient for the responsibilities.

یہی وہ مقدس ذمہ داریاں تھیں جن کے تحفظ کی خاطر آزاد کشمیر حکومت کو ختم کر کے جنرل ضیاء الحق نے ایک بریگیڈیئر کو کشمیری عوام کا مالک بنا دیا تھا۔ ایسا بے مہار حق نوآبادیاتی قانون سازی کی ایک عام سی مثال ہے جبکہ ہمارا دعویٰ Entigatened Moderation اور اکیسویں صدی میں باوقار قدم رکھنے کا ہے۔ آج بھی کشمیری عوام پاکستان کے عوام کی خواہشات کے خلاف ایک غاصب اور آمر حکمران کی قلم کے اشارے کے محتاج ہیں نیز بروئے دفعہ 50

آڈیٹر جنرل کی تعیناتی مقتدر اعلیٰ پاکستان کے حکم کے مطابق عمل میں لائی جائے گی۔ جبکہ عدالت العظمیٰ اور عدالت العالیہ چیف جسٹس صاحبان سمیت تمام جج چیئرمین کشمیر کونسل کی منظوری کے بغیر تعینات نہیں کیے جاسکتے۔ ایکٹ 1974ء کی آڑ میں آزادی پسند لوگوں پر ملازمتوں پر پابندی عائد کردی گئی ہے جبکہ حق انتخاب کے دروازے ان پر بند ہیں۔ یوں اس ایکٹ کو نہ جمہوری اور نہ ہی اخلاقی کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ ایکٹ 1974ء اقوام متحدہ کی قراردادوں اور بین الاقوامی حقوق انسانی چارٹر کے صریحاً متضاد ہے۔

ایکٹ 1974ء میں ترمیم، وقت کا تقاضا

اگر بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایکٹ 1974ء سراسر انسانی حقوق کے منافی، کشمیری عوام کے حقِ خودارادیت کے لئے زہرِ قاتل اور خطۂ آزاد کشمیر کے تشخص، وقار اور آئینی حیثیت میں سدِ راہ کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔

14 اکتوبر 1947ء اور 24 اکتوبر 1947ء کو ڈوگرہ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے جب اس حکومت کا اعلامیہ جاری کیا گیا تھا تو اس میں یہ بات زور دے کر کہی گئی تھی کہ "یہ حکومت ساری ریاست جموں کشمیر کی نمائندہ، بااختیار، انقلابی اور جمہوری حکومت ہوگی۔ یہ ساری ریاست جموں وکشمیر کی آزادی کی ضامن ہوگی۔" اگر یہ اعلامیہ جاری کرنے والے اپنے مؤقف میں درست اور سچے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومتِ آزاد کشمیر کو ایک لولی لنگڑی اور وزارتِ امورِ کشمیر کی دم چھلا انتظامیہ کس نے بنا کر رکھ دیا ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون آزادیٔ ہند کی رو سے شخصی ریاستوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ آزاد اور خود مختار رہ سکتی ہیں۔ یوں جب مسئلہ کشمیر کو بھارت اقوام متحدہ میں لے گیا تو سلامتی کونسل نے کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کو تسلیم کرتے ہوئے آزاد کشمیر میں قائم ہونے والی حکومت کو کشمیریوں کی مقامی حکومت تسلیم کرتے ہوئے آزاد کشمیر میں قائم ہونے والی حکومت کو کشمیریوں کی مقامی حکومت تسلیم کیا اور اسے رائے شماری کے انعقاد تک نظم و نسق چلانے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حکومتِ آزاد کشمیر مکمل طور پر آزاد، بااختیار، جمہوری اور عالمی سطح پر تسلیم شدہ نمائندہ حکومت ہوتی جو ریاستی عوام کے جملہ حقوق کی وارث ہونے کا ثبوت دیتی لیکن عملاً ایسا نہ ہوسکا خطہ آزاد کشمیر کو وزارتِ امورِ کشمیر کے تابع کر دیا گیا۔ جی، او، سی مری، چیف سیکرٹری، سیکرٹری مالیات، آئی جی پولیس اور آڈیٹر جنرل ایسے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر حکومت پاکستان نے اپنے لینٹ آفیسران کو مختارِ کل بنا کر بٹھا دیا۔ رولز آف بزنس اور ایکٹس کی آڑ لیتے ہوئے حکومتِ آزاد کشمیر کو کٹھ پتلی اور پاکستانی بیوروکریسی کی دم چھلا بنا دیا گیا۔ آزاد کشمیر کا وزیر اعظم اور وزراء کی فوج ظفر موج پاکستانی حکمرانوں کے "بلا تنخواہ سپاہی" "اردلی" اور "مجاور" بن بیٹھے۔

پاکستان کے نیتاؤں نے اور پالیسی سازوں نے ہمیشہ یہ پالیسی اختیار کیے رکھی ہے کہ آزادیٔ کشمیر کے بیس کیمپ کو بے حس کیمپ بنانے کے لئے یہاں بدکردار، کرپٹ، جھوٹے، بدعنوان، بلیک میلر، بے ایمان

عناصر کو حکومت سونپی جائے تاکہ وہ قانون، آئین، انصاف، آزادی، جمہوریت اور عظیم انسانی آدرشوں کی دھجیاں بکھیر سکیں۔ پاکستانی سرکار کی یہ "قومی پالیسی" تادمِ تحریر خطۂ بدنصیب "آزاد کشمیر" میں جاری و ساری ہے۔ یہاں کے "پالشیے" اور "مالشیے" ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دوڑ میں لگے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات میں آزاد کشمیر کے عوام پر مسلط کردہ ایکٹ 1974ء غلامی کی بدترین دستاویز نہیں تو اور کیا ہے؟ آزاد کشمیر کے باشعور، پڑھے لکھے اور سنجیدہ حلقے اِن دنوں اس ایکٹ میں ترمیم کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن یہ ترمیم اس وقت تک کشمیری عوام کے مفاد میں نہیں لائی جاسکتی جب تک عوام باکردار، باعمل، سچی، اور محبِ وطن سیاسی قیادت کا انتخاب نہ کرلیں۔ ایسی قیادت کے چناؤ کے نتیجے میں جو اسمبلی معرضِ وجود میں آئے گی وہ یقیناً ایک قومی اسمبلی ہوگی، یہ عوام کے حقوق کی محافظ ہوگی، یہ آزادیٔ وطن کی ضامن ہوگی اور یہ انسانی قدروں کی نگہبان ہوگی۔

یہ اسمبلی خطۂ آزاد کشمیر کے لئے خود قانون سازی کرے گی اور ایسا آئین تشکیل دے گی جو کشمیری عوام کی صحیح معنوں میں نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہوں۔ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ آزاد کشمیر میں قانون ساز اسمبلی کے نام پر جو اسمبلی بنی ہوئی ہے اسے قانون سازی کا اختیار ہی نہیں ہے۔ یہ اختیار کشمیر کونسل اور اس کے چیئرمین کے پاس ہے۔ جو ایک غیر ریاستی باشندہ ہوتا ہے۔

آزاد کشمیر میں ایک ایسے آئین کی ضرورت ہے جو محبِ وطن ریاستی ماہرینِ قانون کا تیار کردہ ہو اور جسے کشمیری عوام کی حقیقی نمائندہ، بااختیار اسمبلی منظور کرے۔ کشمیری عوام کے حقوق کی غاصب پاکستانی حکومت سے ایکٹ 1974ء میں ترمیم کا مطالبہ کرنا اس شعر کے مصداق ہے۔

میر بھی کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

(میر تقی میر)



12

مسئلہ کشمیر

پسِ منظر

حالات وواقعات

اقوامِ متحدہ کی قراردادیں

منصفانہ حل

سول سوسائٹی فریڈم مارچ

پسِ منظر

برعظیم ہند اور سنٹرل ایشیاء کے سنگم پر واقع خطہ کشمیر ہزار ہا سال سے ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اپنی جداگانہ شناخت اور تشخص رکھتا ہے۔ یہ ملک مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا مسکن ہے۔ اپنے فطری حسن جمال اور وسائل سے مالا مال ہونے کے سبب پڑوسی مملکتوں اور بیرونی حملہ آوروں نے اسے کئی بار اپنی ہوس ملک گیری اور جارحیت کا نشانہ بنایا۔ مغلوں کے عہد (1586ء) سے پہلے یہ ایک آزاد، پُرامن اور خوشحال ملک تھا۔ لیکن مغلوں، افغانوں اور سکھوں نے یکے بعد دیگرے اس پر قبضہ کر کے ایک طرف اس کی آزاد حیثیت ختم کر دی اور دوسری طرف یہاں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ 16 مارچ 1846ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین طے پانے والے معاہدہ امرتسر کی رو سے اس ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ جموں کے ڈوگرہ خاندان کے پاس آ گیا۔ ڈوگرہ عہد میں کشمیری عوام نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے لازوال جدوجہد کی جس کے نتیجے میں انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ عہد 1846ء سے 1947ء تک محیط ہے۔ آئینی حقوق کی جدوجہد اور سیاسی شعور کی بیداری کے نتیجے میں ریاست میں جو عوامی تحریکیں اُٹھیں اُن کے سبب ریاست میں سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں۔ 1934ء میں کشمیر اسمبلی کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستان بھر کی شخصی ریاستوں میں ریاست جموں کشمیر کو تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے منفرد حیثیت حاصل تھی۔

دوسری جنگ عظیم (1939-1945ء) میں معاشی طور پر مفلوج ہونے کے سبب جب انگریز سامراج

نے برعظیم کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تو 3 جون 1947ء کو ایک منصوبہ طے پایا جس کے مطابق وائسرائے ہند کے زیرِ انتظام برطانوی ہند کو دو قومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم کیا جانا تھا جبکہ تاج برطانیہ کے ماتحت 565 دیسی ریاستوں کو تقسیم ہند کے منصوبے کی رو سے یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہو جائیں یا آزاد و خود مختار رہیں۔ 16 جون 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے قانون آزادی ہند Indian Independence Act پاس کیا جس کی دفعہ 7 ذیلی دفعہ 2 کے تحت تاج برطانیہ کا ہندوستان سے اقتدارِ اعلیٰ ختم کر دیا گیا اور تمام شخصی ریاستوں سے کیے گئے معاہدے کالعدم قرار دیے گئے۔ اس ایکٹ کی رو سے ریاستیں برطانوی اقتدارِ اعلیٰ سے چھوٹ گئیں اور وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہو گئیں۔ ریاستوں پہ یہ پابندی عائد نہیں کی گئی تھی کہ وہ بھارت کے ساتھ شامل ہوں یا پاکستان کے ساتھ۔ کشمیر، حیدرآباد اور جوناگڑھ کی ریاستوں نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا۔ باقی تمام ریاستیں برضا و رغبت یا معروضی حالات کے سبب ہندوستان و پاکستان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ والیانِ ریاست کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ 15 اگست 1947ء سے پہلے پہلے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیں۔ مذکورہ بالا تینوں ریاستوں نے فیصلہ کرنے میں تاخیر کر دی۔ 14، 15 اگست 1947ء کو ہندوستان کی تقسیم کے سبب پاکستان اور بھارت الگ الگ ملک کے طور پر آزاد ہوئے اور تاج برطانیہ کا اقتدارِ اعلیٰ بظاہر ختم ہو گیا۔

حالات و واقعات

تقسیمِ ہند کے وقت ریاست جموں کشمیر پر مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت تھی۔ مہاراجہ اپنی ریاست کو آزاد و خود مختار رکھنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے دونوں نو آزاد مملکتوں میں سے کسی ایک ساتھ الحاق کے بجائے دونوں کو دوستی اور مستقبل کے تعلقات کی استواری کے لئے 12 اگست 1947ء کو ایک معائدے کی پیش کش کی جسے معائدہ قائمہ (Stand Still Agreement) کہا جاتا ہے۔ پاکستان نے اس معاہدے کو تسلیم کر لیا جبکہ ہندوستان نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

ابھی معائدہ قائمہ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ 22 اکتوبر 1947ء کو معائدہ قائمہ کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے پاکستان کے صوبہ سرحد کے ہزاروں مسلح قبائلیوں نے ریاست جموں کشمیر پر حملہ کر کے ریاست میں قتل و غارت، لوٹ مار اور اغواء کا بازار گرم کر دیا۔ یہ وحشی قبائل خون کی ہولی کھیلتے ہوئے سرینگر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ ☆1

☆1 1947ء میں ریاست جموں کشمیر پر قبائلی حملے کی تفصیلات جاننے کے لیے حسب ذیل دو کتابوں کا مطالعہ ضرور کریں۔
1۔ "یادوں کے زخم" از محمد سعید اسعد مطبوعہ ادارہ نکس میرپور 2۔ "ایک ماں کی سچی کہانی" از کرشنا مہتا مطبوعہ ادارہ نکس

مسلح قبائل کے ہمراہ پاکستان کی فوج کے آفیسر اور جوان بھی سادہ کپڑوں میں ملبوس شامل تھے۔ 26 اکتوبر کو اس صورتِ حال سے خوف زدہ ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ دارالحکومت سرینگر سے بھاگ کر جموں چلا گیا۔ اس نے اپنی ریاست اور عوام کو قبائلیوں سے بچانے کے لیے 26 اکتوبر 1947ء کو گورنر جنرل ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھ کر ہندوستان سے فوجی مدد طلب کی۔ ہندوستان نے فوجی مدد کو ریاست کے الحاق سے مشروط کیا۔ مجبوراً مہاراجہ سے ایک الحاق نامے پر دستخط لیے گئے اور 27 اکتوبر 1947ء کو ریاستی دارالحکومت سرینگر کے ہوائی اڈے پر ہندوستانی تربیت یافتہ فوج اُترنا شروع ہو گئی۔ پاکستانی فوج بھی اعلانیہ طور پر ریاست میں داخل ہو گئی۔ دونوں ممالک کی افواج آمنے سامنے ہوئیں تو محاذِ کشمیر پر زبردست جنگ چھڑ گئی۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یکم جنوری 1948ء کو ہندوستان مسئلہ کشمیر کو UNO میں لے گیا۔ UNO میں ہندوستان نے شکایت کی کہ پاکستان نے ریاست جموں کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے قبائلیوں سے حملہ کروایا ہے۔ لہٰذا پاکستان کو کشمیر سے باہر نکالا جائے۔ سلامتی کونسل نے پاکستان کا مؤقف بھی سنا اور اس مسئلہ پر متفقہ قراردادیں پاس کیں۔ اقوام متحدہ نے اس مسئلے کو "The situation in jammu Kashmir" کا عنوان دیا لیکن پاکستانی نمائندے ظفر اللہ خان کی تحریک پر اس عنوان کو بدل کر نیا عنوان رکھا گیا۔ "India pakistan question"۔ اقوام متحدہ نے 20 جنوری 1948ء کو ایک خصوصی کمیشن تشکیل دیا جسے UNCIP (یونائیٹڈ نیشن کمیشن فار انڈیا اینڈ پاکستان) کا نام دیا گیا۔ اس کمیشن نے تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد بہت سی قراردادیں پاس کیں جن میں سے دو قراردادوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پہلی قرارداد 13 اگست 1948ء کو پاس کی گئی۔ اس قرارداد میں کشمیری عوام کو غیر محدود اور غیر مشروط حق خودارادیت دیا گیا جبکہ دوسری قرارداد 5 جنوری 1949ء کو پاس ہوئی۔ اس قرارداد کی شق 1 میں پاکستانی اور بھارتی مندوب کی تحریک پر غیر محدود حق خودارادیت کو الحاقِ بھارت یا الحاقِ پاکستان تک محدود کر دیا گیا۔ دونوں قراردادوں کا متن بذیل ہے

قرارداد 13 اگست 1948

قرارداد جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان نے 13 اگست 1948ء کو منظور کی

اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان اور پاکستان:۔ ریاست جموں و کشمیر کے متعلق ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں نے جس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے اس پر پوری احتیاط کے ساتھ غور و خوض کے بعد، اور یہ رائے رکھتے ہوئے کہ مخالفانہ کارروائیوں اور ان حالات کا فوری خاتمہ ضروری ہے۔ جن کا جاری رہنا بین الاقوامی امن اور سلامتی کے لیے خطرے کا باعث ہے تاکہ کمیشن ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اس صورت حالات کو قطعی طور پر حل کرنے میں

...کے لیے اپنی کوششوں کو بروئے کار لا سکے۔

ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے سامنے ان تجاویز کو پیش کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

...اول

التوائے جنگ کا حکم

...ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اس امر پر اتفاق کرتی ہیں کہ ان کی اپنی اپنی ہائی کمان علیحدہ علیحدہ مگر بیک وقت ...جنگ کا حکم جاری کر دیں گی جو ریاست جموں کشمیر میں ان کے کنٹرول میں تمام فورسز پر حاوی ہو گا اور جو ان تجاویز کو ...حکومتوں کی طرف سے قبول کر لینے کے بعد جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ چار دن کے اندر جاری کر دیا جائے گا۔

...ب) ہندوستانی اور پاکستانی افواج کی ہائی کمان یہ تسلیم کرتی ہیں کہ وہ ایسے تمام اقدامات سے اجتناب کریں گی جن ...سے ریاست جموں کشمیر میں ان کے کنٹرول میں فورسز کی فوجی طاقت میں اضافہ ہو جائے۔ ...تجاویز کے مطابق ان کے کنٹرول میں فورسز میں وہ تمام منظم یا غیر منظم، فورسز شامل ہیں۔ جو اس طرف جنگ اور ...کارروائیوں میں مصروف ہوں۔

(ج) ہندوستانی اور پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف فوجوں کی موجودہ تعیناتی میں ایسی تبدیلیاں کرنے کے لیے جو ...جنگ بندی میں آسانیاں پیدا کریں، فوری طور پر آپس میں صلاح و مشورہ کریں۔

(د) کمیشن اپنی مرضی کے مطابق اور جہاں تک قابلِ عمل ہو گا، فوجی مبصر مقرر کرے گا، جو کمیشن کے اختیارات کے ...ت اور دونوں ہائی کمان کے تعاون سے التوائے جنگ کے حکم کی پابندی کی نگرانی کریں گے۔

(ہ) ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اپنے اپنے عوام سے یہ اپیل کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ ایسی فضا ...پیدا کرنے اور اسے بحال رکھنے میں مدد دیں جو مذاکرات کو جاری رکھنے کے لیے سازگار ہو۔

...حصہ دوم

جنگ بندی کا معاہدہ

فوری طور پر جنگ بند کر دینے کے متعلق حصہ اول میں شامل تجاویز کو قبول کر لینے کے ساتھ ہی دونوں ...حکومتیں حسب ذیل اصولوں کو جنگ بندی کے سمجھوتہ کی بنیاد کے طور پر تسلیم کرتی ہیں۔ جس کی تفصیلات ان کے ...نمائندوں اور کمیشن کے درمیان بات چیت کے ذریعہ طے کی جائیں گی۔

(الف)

(۱) چونکہ ریاست جموں کشمیر میں پاکستانی فوج کی موجودگی اس صورتِ حالات میں نمایاں تبدیلی کے مترادف ہے جو اس

نے سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس لیے حکومتِ پاکستان ریاست سے اپنی فوجوں کو واپس بلانے پر رضامند ہے۔

(۲) حکومتِ پاکستان اس امر کی پوری کوشش کرے گی کہ ریاست جموں کشمیر سے قبائلی اور پاکستانی باشندے جو وہاں کی رہائش نہیں رکھتے ہیں اور لڑائی کی خاطر ریاست میں داخل ہوئے ہیں، ریاست سے واپس چلے جائیں۔

(۳) جس علاقہ سے پاکستانی فوج کی واپسی عمل میں آجائے گی اس کا نظم ونسق قطعی فیصلہ تک مقامی حکام کے سپرد کمیشن کی نگرانی میں ہوگا۔

(ب)

(۱) جب کمیشن حکومت ہندوستان کو یہ اطلاع دے دے گا کہ قبائلی اور پاکستانی باشندے جن کا ذکر حصہ دوم۔الف ۲ میں کیا گیا ہے۔ ریاست سے واپس چلے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ صورتِ حالات ختم ہوگئی ہے جسے حکومت ہندوستان نے سلامتی کونسل کے سامنے ریاست میں اپنی فوجوں کی موجودگی کی وجہ قرار دیا تھا اور یہ کہ ریاست جموں کشمیر سے پاکستانی فوجوں کی واپسی بھی عمل میں لائی جا رہی ہے۔ حکومتِ ہندوستان اپنی افواج کے بیشتر حصہ کا انخلا ایسے مرحلوں میں، جو کمیشن کے ساتھ طے کر لیے جائیں گے، شروع کر دینے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔

(۲) ریاست جموں کشمیر میں صورتِ حالات کے قطعی فیصلہ کے متعلق شرائط کی منظوری تک حکومتِ ہندوستان جنگ بندی لائن کی حدود کے اندر اپنی افواج کی اتنی کم سے کم تعداد رکھے گی جو کمیشن کی رضامندی کے مطابق امن وامان بحال رکھنے میں مقامی حکام کی مدد کے لیے ضروری ہوگی۔ کمیشن جہاں مناسب سمجھے گا، مبصر متعین کرے گا۔

(۳) حکومتِ ہندوستان یہ ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ ریاست جموں کشمیر کی حکومت ایسے تمام ذرائع جو اس کے اختیار میں ہوں، اعلانیہ طور پر اس امر کا اظہار کر دے گی کہ امن وامان کو بحال رکھا جائے گا اور تمام انسانی وسیاسی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

(ج)

(۱) دستخط ہو جانے کے بعد، جنگ بندی کے سمجھوتہ کا پورا متن یا اس کے اصولوں پر مشتمل ایک اعلامیہ، جیسا کہ دونوں حکومتوں اور کمیشن کے درمیان طے ہو جائے گا، عام اطلاع کے لیے شائع کر دیا جائے گا۔

حصہ سوئم

حکومتِ ہندوستان اور حکومتِ پاکستان اپنی اس خواہش کا اعادہ کرتی ہیں کہ ریاست جموں کشمیر کی آئندہ حیثیت عوام کی خواہشات کے مطابق متعین کی جائے گی اور اس مقصد کے لیے، جنگی سمجھوتہ کو قبول کر لینے کے بعد، دونوں حکومتیں کمیشن کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہیں تا کہ ایسی منصفانہ شرائط طے کی

جن کے تحت ایسی آزادانہ رائے کا اظہار یقینی ہو۔

قرارداد 5 جنوری 1949ء

اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان

حکومت ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے ان کے خطوط مورخہ 23 دسمبر اور 25 دسمبر 1948ء کے بموجب ذیل اصولوں کو جنہیں کمیشن کی قرارداد 13 اگست 1948ء میں اضافہ کی حیثیت حاصل ہے، تسلیم کرنے

...

ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ ریاست جموں کشمیر کے الحاق کا فیصلہ غیر جانبدار اور منصفانہ رائے شماری کے جمہوری طریقہ کے مطابق کیا جائے گا۔

(۲) رائے شماری کا انعقاد اس وقت ہوگا جب کمیشن نے یہ معلوم کر لیا کہ التوائے جنگ اور جنگ بندی کے انتظامات جن کا ذکر کمیشن کی قرارداد مورخہ 13 اگست 1948ء کے حصہ اول اور دوم میں کیا گیا ہے، پر عمل ہو گیا ہے اور رائے شماری کے لیے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔

(۱) اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کمیشن کی رضامندی سے ناظم رائے شماری کو نامزد کریں گے جو ایک اعلیٰ بین الاقوامی شخصیت ہوگی اور جسے عام اعتماد حاصل ہوگا۔ اسے ریاست جموں کشمیر کی حکومت رسمی طور پر اس کے عہدہ پر مقرر کرے گی۔

(ب) ناظم رائے شماری ریاست جموں کشمیر سے وہ اختیارات حاصل کرے گا جو وہ رائے شماری کے انتظام اور اہتمام اور اس کے غیر جانبدارانہ اور آزادانہ انعقاد کے لیے ضروری تصور کرے گا۔

(ج) ناظم رائے شماری کو اختیار ہوگا کہ مبصرین کی مدد کے لیے جس قدر سٹاف کی ضرورت ہو اسے مقرر کر سکے۔

(۱) کمیشن کی قرارداد مورخہ 13 اگست کے حصہ اوّل اور دوم پر عمل درآمد کے بعد اور جب کمیشن کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ریاست میں پرامن حالات بحال ہو گئے ہیں تو کمیشن اور ناظم رائے شماری حکومت ہندوستان کے مشورہ سے ہندوستان اور ریاست کی مسلح افواج کو ہٹانے کا آخری فیصلہ کریں گے اور یہ فیصلہ ریاست کے تحفظ اور رائے شماری کی آزادی کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے گا۔

(ب) جہاں تک اس علاقہ کا تعلق ہے۔ جس کا ذکر قرارداد مورخہ 13 اگست کے حصہ دوم ا میں کیا گیا ہے۔ ناظم رائے شماری اور کمیشن اس علاقہ میں مسلح افواج کے متعلق آخری فیصلہ مقامی حکام کے مشورہ سے کریں گے۔

(۵) ریاست کے اندر تمام سول اور فوجی حکام اور تمام بڑے بڑے سیاسی عناصر کو رائے شماری کی تیاری اور انعقاد میں

ناظم رائے شماری کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔

٦(ا) ریاست کے تمام باشندوں کو جو بدامنی کی وجہ سے ریاست سے چلے گئے تھے واپس آجانے کی دعوت دی جائے گی اور انہیں واپس آکر شہریوں کی حیثیت سے تمام حقوق کے استعمال کا حق حاصل ہوگا۔ ان کی واپسی میں مدد دینے کے لیے دو کمیشن مقرر کیے جائیں گے جن میں سے ایک ہندوستان کے نمائندوں پر اور دوسرا پاکستان کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ کمیشن ناظم رائے شماری کی ہدایات کے مطابق کام کریں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اور ریاست جموں کشمیر کے اندر تمام حکام اس دفعہ کو عملی جامعہ پہنانے میں ناظم رائے شماری کے ساتھ تعاون کریں گے۔

(ب) تمام ایسے افراد جو ریاست کے شہریوں کے علاوہ کسی دوسرے مقصد سے ریاست میں داخل ہوئے ہیں انہیں ریاست سے واپس جانا ہوگا۔

(۷) ریاست جموں کشمیر کے اندر تمام حکام یہ ذمہ داری قبول کرتے ہیں کہ ناظم رائے شماری کے تعاون سے وہ اس امر کے پابند ہوں گے کہ۔

ا۔ رائے شماری کے دوران ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا نہیں جائے گا نہ ان پر دباؤ ڈالا جائے گا اور نہ ہی انہیں رشوت دی جائے گی۔

ب۔ ریاست بھر میں جائز سیاسی سرگرمی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ ریاست کے تمام باشندے بلا لحاظ عقیدہ، ذات یا جماعت اپنے خیالات کے اظہار میں اور ریاست میں پریس، تقریر اور اجتماع اور سفر کی آزادی ہوگی جس میں ریاست میں قانونی طور پر داخل ہونے اور باہر جانے کی آزادی بھی شامل ہے۔

(ج) تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

(د) ریاست کے تمام حصوں میں اقلیتوں کی پوری حفاظت کی جائے گی۔

(ہ) کسی کو عتاب کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

۸۔ ناظم رائے شماری کو اگر بعض مسائل میں امداد کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ کمیشن سے رجوع کرے گا اور کمیشن اگر مناسب سمجھے گا تو وہ اپنی طرف سے ناظم رائے شماری کو ایسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اختیار دے گا جو اسے سونپی گئی ہیں۔

۹۔ رائے شماری کے مکمل ہو جانے پر ناظم رائے شماری اس نتیجہ سے کمیشن اور ریاست جموں کشمیر کو مطلع کرے گا۔ اس کے بعد کمیشن سلامتی کونسل کے سامنے یہ تصدیق کرے گا کہ رائے شماری منصفانہ اور آزادانہ ہوئی ہے یا نہیں۔

۱۰۔ جنگ بندی کے سمجھوتہ پر دستخط کے بعد کمیشن کی قرارداد مورخہ 13 اگست 1948ء کے حصہ سوم میں تجویز کردہ صلاح و مشورہ کے مطابق متذکرہ بالا تجاویز کی مزید وضاحت کر لی جائے گی۔ ناظم رائے شماری کو اس بات چیت میں

...ر یک رکھا جائے گا۔

...کمیشن حکومت ہندوستان اور پاکستان سے سفارش کرتا ہے کہ کمیشن کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے مطابق جو سمجھوتہ ہو چکا ہے اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ یکم جنوری 1949ء کی رات کو آدھی رات سے ایک منٹ پہلے جنگ بندی کے احکام جاری کرنے کی فوری کارروائی کریں۔

کمیشن فیصلہ کرتا ہے کہ 13 اگست 1948ء کی قرارداد اور متذکرہ بالا اصولوں میں اسے جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ مستقبل قریب میں برصغیر میں واپس چلا جائے۔

...فریقین کی رضامندی سے طے پایا کہ مسئلہ کشمیر تین مراحل میں حل کیا جائیگا۔

ا۔ جنگ بندی ۲۔ فوجوں کی واپسی ۳۔ رائے شماری

اقوام متحدہ کی ایک سالہ بھرپور کوششوں سے طے شدہ فارمولے کے تحت یکم جنوری 1949ء کو سلامتی کونسل کی اپیل پر جنگ بندی کے معاہدے پر عمل کرتے ہوئے دونوں ممالک نے جنگ بند کر دی۔ 27 جولائی 1949ء کو دونوں ممالک کی افواج کے مابین ایک جنگ بندی لائن کا تعین کیا گیا اور فریقین کو پابند کیا گیا کہ وہ اس لائن کو عبور نہ کریں۔ جنگ بندی کا پہلا مرحلہ مکمل ہونے پر دوسرے مرحلے یعنی فوجوں کی واپسی پر عمل درآمد کے لیے کمیشن مقرر کیے گئے اور ناظم رائے شماری کا تقرر ہوا۔ یکے بعد دیگرے 26 اگست 1949ء کو جنرل نمٹز، 17 دسمبر 1949ء کو جنرل میکناٹن، 12 اپریل 1950ء کو سر اودن ڈکسن، 7 ستمبر 1951ء کو ڈاکٹر فرینک پی گراہم بطور مصالحت کنندہ کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کے لیے رضا مند کرنے کے لیے کراچی اور دہلی میں سرگرداں رہے۔ لیکن دونوں ممالک نے حیلہ سازی اور ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے فوجوں کے انخلاء پر عمل درآمد نہ کیا جس کے سبب ریاست میں رائے شماری کی نوبت ہی نہ آسکی۔ 21 اپریل 1957ء کو سویڈن کے نمائندے گنر وی جیئرنگ کو ثالث مقرر کیا گیا۔ لیکن دونوں ملکوں کی ہٹ دھرمی کے سامنے اس کا بھی بس نہ چلا تو اس نے UNO میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے عندیہ ظاہر کیا کہ "دونوں ملک کشمیر سے فوجیں نکالنے میں سنجیدہ نہیں ہیں"۔

16 فروری 1957ء کو پاکستان کی امریکہ نواز پالیسیوں اور منافقانہ چالوں سے تنگ آکر روس نے مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں ویٹو کر دیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے مردہ خانے میں پڑا ہوا ہے۔ حالات و واقعات اس امر کے گواہ ہیں کہ کشمیر پر قبضہ کرنے والے دونوں ممالک فوجوں کے انخلاء اور رائے

شماری کے حق میں نہیں تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نیت کا فتور پھیلتا چلا گیا اور انہوں نے مستقل طور پر کشمیر پر قبضہ جمانے کی حکمتِ عملی اختیار کر لی۔ اس مسئلے کی آڑ میں کبھی جنگ نے تباہ کاریاں مچائیں، کبھی مذاکرات کی بساط بچھائی گئی اور کبھی دوستی اور اعتماد کی بحالی کے ڈرامے رچائے گئے۔ تاشقند، شملہ، لاہور، واشنگٹن اور اسلام آباد کے ایوانوں میں کشمیر کی بندر بانٹ کے منصوبے بنے لیکن یہ سب کوششیں کشمیری عوام کو ان کے پیدائشی حق آزادی اور رائے شماری کے حق سے دست بردار نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے نہتے اور مظلوم عوام نے بے سروسامانی کے عالم میں بھی گزشتہ 6 دھائیوں سے اپنی جدوجہد آزادی جاری رکھی ہوئی ہے۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں کشمیر کے آر پار گزشتہ 65 برسوں سے لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے، عصمتیں لٹیں، گھر بار اجڑے، کھیت کھلیان ویرانوں میں بدل گئے لوگ بے گھر اور بے آبرو ہوئے لیکن پاکستان اور ہندوستان اس مسئلے کو حل کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اقوام عالم کا نمائندہ ادارہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا نہ کر سکا۔ تاہم ان ناکامیوں کا طویل سفر طے کرنے کے باوجود کشمیری عوام کے عزمِ صمیم کو جھکایا نہیں جا سکا۔ کشمیری عوام کا یہ پختہ عزم ہے کہ وہ اپنے پیدائشی حق، حقِ خودارادیت کے حصول تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

مسئلہ کشمیر کی بنیاد اور اساس حقِ خودارادیت ہے۔ یہ کوئی علاقائی یا دوطرفہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے جو برس ہا برس تک اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر زیرِ کار رہا ہے۔ بھارت اور پاکستان نے اسے دوطرفہ علاقائی تنازع ثابت کرنے کے لیے کبھی معاہدہ تاشقند، کبھی معاہدہ شملہ، کبھی اعلانِ لاہور اور کبھی اعلان اسلام آباد کی بساط بچھا کر اس کی بین الاقوامی حیثیت ختم کرنے کی کوشش کی اور دنیا کو یہ تاثر دیا کہ یہ ان دونوں کا کوئی علاقائی جھگڑا ہے جسے یہ آپس میں بات چیت یا مذاکرات سے حل کر لیں گے۔ دوطرفہ مذاکرات کی شعبدہ بازیاں سیکرٹری خارجہ کی سطح سے لے کر سربراہانِ مملکت تک آئے روز جاری رہتی ہیں۔ ان مذاکرات سے تقسیم کشمیر کی سازشوں کے سوا کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ یہ بلی چوہے کا کھیل ہے جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ جب تک ہندوستان اور پاکستان کشمیر سے اپنا فوجی تسلط ختم نہیں کرتے اور کشمیری عوام کو ایک آزادانہ اور منصفانہ ماحول میں رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع نہیں دیتے اس وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھارت اور پاکستان کا دوطرفہ مسئلہ نہیں بلکہ ایک قوم کے حقِ خودارادیت کا مسئلہ ہے۔ دونوں فریقین نے اقوام عالم کے سامنے اس حقیقت کو تسلیم کر رکھا ہے کہ وہ کشمیری عوام کو حقِ خودارادیت کا موقع دیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے آپ کو مزید تباہی سے بچانے اور کشمیر کو میدان جنگ بننے سے بچانے کی خاطر پُرامن طریقے سے رائے شماری کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکالیں۔ بصورتِ دیگر یہ مسئلہ جنوبی ایشیاء کے اس خطے کو تباہی و بربادی سے دوچار کر دے گا۔ جس کی ذمہ داری ہندوستان اور پاکستان کے ناکام پالیسی سازوں اور

کی سردمہری پر ہو گی۔

مسئلہ کشمیر کا مستقل، دیر پا اور منصفانہ حل

مسئلہ کشمیر کا مستقل بنیادوں پر دیرپا، قابلِ قبول، منصفانہ اور جمہوری حل انتہائی ضروری ہے۔ دونوں ممالک اس مسئلے کو حل نہ کر کے کئی طرح کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کا شکار ہیں۔ سیاسی سطح پر عالمی برادری میں ان کی ساکھ بُری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ ایک سادہ اور عام فہم مسئلے کو حل نہ کر کے دونوں ممالک کے مدبرین اور سیاسی راہنماؤں نے اپنی قابلیت وصلاحیت پر ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیا ہے۔ سماجی سطح پر اس مسئلے نے دونوں ممالک کے عوام کو احساسِ شکست اور احساسِ ندامت سے دوچار کر رکھا ہے۔ سنجیدہ اور باشعور حلقوں میں بے چینی اور مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ وہ اس مسئلے کے حل نہ ہونے کا ذمہ دار اپنی لیڈرشپ کو ٹھہراتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر نے دونوں ممالک کی اقتصادیات کو بھی بُری طرح متاثر کیا ہے۔ اپنے وسائل اور آمدن کا ایک بڑا حصہ جو ان ممالک کے عوام کی غربت، بھوک، بیماری، تعلیم اور روزگار کے لیے خرچ ہونا چاہیے تھا وہ فوجی کشمیر فتح کرنے کی آڑ میں اپنی ذاتی عیاشیوں اور بے پناہ جنگی ساز وسامان پر خرچ کرتی رہی ہے۔ حالانکہ اگر بے حساب دولت ملکی تعمیر وترقی کے لیے خرچ کی جاتی تو آج ہندوستان اور پاکستان دنیا کی بڑی اقتصادی طاقتوں کی صف میں کھڑے ہوتے۔

کشمیری عوام کے نقطہ نظر سے بھی اس کا حل نہایت ضروری ہے کشمیر کے عوام بلاتمیز مذہب، رنگ ونسل اور علاقہ اس مسئلے کا ایک قابلِ قبول اور آبرومندانہ حل چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس مسئلے کی وجہ سے کشمیری قوم کی چار نسلیں بُری طرح متاثر ہوئی ہیں لوگ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی سطح پر بے شمار مسائل کا شکار ہیں۔

ان حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دیرینہ تنازع کو کیسے حل کیا جائے تاکہ مسئلہ کے تینوں فریق، کشمیری عوام، بھارت اور پاکستان سکھ اور امن کا سانس لے سکیں۔

مسئلہ کشمیر کا پُرامن، جمہوری اور منصفانہ حل یہ ہے کہ دونوں قابض فریق اس بات پر آمادہ ہوں یا عالمی برادری انہیں آمادہ کرے کہ مسئلہ جہاں سے بگڑا تھا وہیں سے اس کو سلجھانے کا آغاز کیا جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اعلانِ آزادی کے وقت یعنی 14، 15 اگست 1947ء کو ریاست جموں کشمیر کی جو آئینی، قانونی اور انتظامی حیثیت تھی اُسے بحال کر دیا جائے۔ اُس وقت تک ریاست جموں کشمیر دونوں نئے آزاد ہونے والے ممالک میں سے کسی ایک کا بھی حصہ نہ تھی۔ ریاست کے عوام نے رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا ابھی تعین کرنا تھا۔ اس دیرینہ تنازع کے حل کے لیے حسب ذیل اقدامات بروئے کار لانا ہوں گے۔

1۔ تقسیم ہند کے وقت کی آئینی پوزیشن بحال کرنے کے لیے ریاست جموں کشمیر سے چین، بھارت اور پاکستان کی تمام مسلح اور غیر ریاستی سول انتظامیہ فی الفور نکل جائے۔

2۔ ریاست جموں کشمیر جو جنگ وجدل کی وجہ سے جبراً تقسیم کی گئی ہے اس کے تمام انتظامی یونٹ (بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور اقصائی چن) ایک مرکز کے تابع لائے جائیں اور جنگ بندی لائن کا خاتمہ کر کے 84,471 مربع میل پر مشتمل ریاست کی جغرافیائی وحدت بحال کر دی جائے۔

3۔ ریاستی وحدت بحال ہونے پر ریاستی سیاسی جماعتوں اور آزادی پسند گروہوں کی مشاورت سے ایک عبوری انتظامیہ تین سال کے لیے قائم کی جائے جو حسب ذیل فرائض سرانجام دے۔

i۔ مقامی نظم ونسق کی بحالی۔

ii۔ ریاست سے ترکِ سکونت کرنے والوں کی واپسی اور آبادکاری۔

iii۔ ریاست کی جغرافیائی سرحدوں کی نگرانی۔

iv۔ رائے شماری کے انعقاد میں UNO کی معاونت۔

4۔ اقوام متحدہ اپنی زیرِ نگرانی ریاست جموں کشمیر میں معروف اصولوں کے تحت حقِ خودارادیت کے حصول کے لیے رائے شماری کروائے۔ اس رائے شماری میں ریاستی عوام ہر طرح کے خوف، ڈر، لالچ، دباؤ اور بیرونی اثر ورسوخ سے ماوراء ہو کر اپنی مرضی اور خوشی سے آزادانہ فیصلہ کریں کہ وہ ریاست جموں کشمیر کو مکمل طور پر آزاد رکھنا چاہتے ہیں یا ہندوستان و پاکستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں۔

5۔ رائے شماری کے ذریعے جو بھی اکثریتی فیصلہ سامنے آئے اُسے کشمیر کے تمام فریق صدقِ دل سے تسلیم کرلیں۔

مسئلہ کشمیر کا دیرپا، جمہوری اور آبرومندانہ حل یہی ہے۔

چارہ گروں کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے، بہت لادوانہ تھے

فیصلہ کن حل۔ سول سوسائٹی فریڈم مارچ

مسئلہ کشمیر کے حل کے ضمن میں اقوامِ متحدہ کے مایوس کُن کردار، اقوامِ عالم کی سرد مہری اور پاکستان اور ہندوستان کے سامراجی عزائم کے نتیجے میں کوئی واضح پیش رفت نہیں ہو سکی۔ 65 برس گزر گئے ہیں۔ کشمیریوں کی چوتھی نسل اب اس قضیئے کے دہانے پر آن کھڑی ہوئی ہے لیکن لیلائے وطن کی آزادی کے عظیم جذبے نے کشمیریوں

...وں سے آزادی کا جوش اور ولولہ ٹھنڈا نہیں ہونے دیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود ...قابض ممالک کی شاطرانہ چالوں اور بدعہدیوں کے سبب جب کوئی نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تو بے چارے ...ی کب تک اقوامِ متحدہ پر تکیہ کیے رہیں گے؟ اور مزید کتنا وقت وہ اس انتظار میں گزار دیں گے انہیں قابض ...حقِ خودارادیت کا موقع فراہم کریں؟

راقم الحروف کی دوٹوک رائے ہے کہ ہندوستان وپاکستان کے سیاست دان، جرنیل اور پالیسی ساز ...کشمیر کا حل قطعاً نہیں چاہتے کیونکہ ان کا مفاد اسی سے وابستہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ الجھا رہے اور وہ اس مسئلے کی آڑ ...ی دکانداریاں چمکاتے رہیں۔ بے شک وہ اس کشمکش میں اپنے وجود سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ وہ مٹ جائیں ...ذلیل ورسوا ہو جائیں گے لیکن کشمیری عوام کو حقِ خودارادیت دینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

اقوامِ متحدہ، جس پر کشمیری تکیہ کیے ہوئے تھے اب مکمل طور پر امریکہ کی لونڈی بن چکا ہے۔ لہٰذا اس ...ی توقع رکھنا اب عبث اور بے کار ہی دکھائی دے رہا ہے۔ عالمِ اسلام کے راہنما یہود وہنود کی خوشنودی اور ...اری میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دوڑ میں لگے ہیں۔ مذکورہ بالا ساری صورت حال کو سامنے ...ئے ہوئے بالآخر مسئلہ کشمیر کو سلجھانے کی ایک ہی صورت بنتی ہے اور ایک ہی حل نظر آتا ہے کہ ریاست جموں کشمیر ...ر پارِ محبِ وطن سیاسی جماعتیں، آزادی پسند گروہ، باشعور افراد، شہداء کے حقیقی وارث، آزادی کے متوالے مرد ...ین، بچے، بوڑھے مزدور، کسان، طالب علم اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لاکھوں انسان "سول ...وسائٹی فریڈم مارچ" کا اہتمام کریں۔ اس فریڈم مارچ میں لاکھوں انسان سروں پر کفن باندھ کر پاکستانی مقبوضہ ...کشمیر سے ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی طرف ایک طے شدہ وقت پر رواں دواں ہوں اسی طرح بھارتی مقبوضہ کشمیر سے ...ستانی مقبوضہ کشمیر کی طرف بھی لاکھوں انسان کفن بدوش ہو کر ڈنڈے اور کلہاڑیاں ہاتھوں میں اٹھائے گھروں ...ے نکلیں اور منحوس خونی لکیر کو اور اس لکیر کی حفاظت پر مامور ناپاک وردی پوشوں کو اٹھا کر اپنے وطن سے باہر پھینک ...یں۔ سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک جب مل جائیں گے تو دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوگی کہ کشمیری عوام کیا ...چاہتے ہیں اور کون کون غاصب ان کے حقِ آزادی پر پہرے لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔

کشمیری عوام کی آزادی کا یقینی اور مختصر راستہ یہی ہے۔ آزادی پسند کشمیریوں کو اس پر غور کرنا ہوگا۔

وما علینا الا البلاغ

محمد سعید اسعد

13 قائدینِ تحریکِ آزادئ کشمیر

ا۔ کے۔ایچ خورشید شہیدؒ

۲۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز

۳۔ خواجہ غلام نبی گلکار

۴۔ محمد مقبول بٹ شہیدؒ

14 سیاسیاتِ کشمیر کی نامور شخصیات

ا۔ شیخ محمد عبداللہ

۲۔ چوہدری غلام عباس

۳۔ میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہؒ

۴۔ سردار محمد ابراہیم خان

کے۔ایچ خورشید شہیدؒ

(1924ء–1988ء)

خورشید حسن خورشید المعروف کے ایچ خورشید 3 جنوری 1924ء کو سری نگر کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی محمد حسن عالمِ باعمل اور درویش صفت انسان تھے۔وہ عرصہ دراز تک گلگت میں بطور ہیڈ ماسٹر خدمات انجام دیتے رہے اور پھر انسپکٹر آف مسلم سکولز کے عہدے پر تعینات رہے۔خورشید حسن کو ابتدائی دینی تعلیم گھر پر دی گئی۔انہوں نے 1938ء میں میٹرک کا امتحان سری پرتاپ سنگھ ہائی سکول سری نگر سے اوّل پوزیشن میں پاس کیا۔اسی سال ایس پی ہائی سکول کو انٹر کالج کا درجہ دے دیا گیا۔خورشید حسن نے ایف اے اسی کالج سے کرنے کے بعد امر سنگھ ڈگری کالج میں داخلہ لے لیا۔انہوں نے کالج کے زمانے میں Best Speaker کا انعام حاصل کیا۔مضمون نویسی کا مقابلہ ہو یا کوئی ڈرامائی پروگرام خورشید حسن علمی و ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

خورشید حسن نے باقاعدہ سیاست کا آغاز ایس پی کالج میں ہونے والے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کیا۔انہوں نے اور ان کے چند ے ساتھیوں نے 1940ء میں ریاست جموں و کشمیر میں مسلم سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی جو کشمیری طلباء کی پہلی سیاسی تنظیم تھی۔خورشید حسن اس کے پہلے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔یونین کے صدر احمد اللہ رعنا تھے۔

ریاست جموں کشمیر میں یہ دور انتشار اور خلفشار کا دور تھا۔ایک طرف مسلمانانِ ریاست ڈوگرہ تسلط سے نجات پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور دوسری طرف مسلم کانفرنس نے اپنے قیام کے سات برس بعد 1939ء کو اپنا وجود نیشنل کانفرنس میں بدل کر شیخ عبداللہ کی پیروی شروع کر دی۔ریاست کا باشعور اور مخلص طبقہ اس تبدیلی کو ملک و ملت کے خلاف بدشگونی خیال کرنے لگا۔مسلم کانفرنس کے نظریاتی کارکن گوشۂ تنہائی میں چلے گئے۔شیخ عبداللہ نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا واحد اور غیر متنازعہ لیڈر ثابت کرنے کے لیے زبردست سیاسی حربے استعمال کیے، لیکن مسلم کانفرنس کے لال جھگڑ بجھنے سے عاری رہے۔1940ء میں جب قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو مسلم کانفرنس کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا۔ریاست میں اسلامی نظریہ حیات اور مثبت طرزِ سیاست پر یقین رکھنے والا ایک بڑا عنصر بے یقینی اور پریشانی کی دلدل میں پھنس چکا تھا۔ان حالات میں مسلم سٹوڈنٹس یونین کا قیام اسلامیانِ ریاست کے لیے حیات آفرین پیغام ثابت ہوا۔یونین کے نوجوان راہنماؤں نے دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد جب یونین کا سیاسی منشور پیش کیا تو مجاہد منزل سے لے کر راج محل تک بڑے بڑوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔مسلم سٹوڈنٹس یونین نے ریاست جموں و کشمیر میں تحریکِ پاکستان کی حمایت میں جس جانفشانی اور لگن سے کام کیا اس کے اعتراف

میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ جالندھر، نومبر 1942ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے یونین کے سیکرٹری جنرل کے ایچ خورشید کو حسنِ کارکردگی کا پرچم عطا کیا اور پرچم تھماتے ہوئے فرمایا "This is Your's and keep it up". سیاست کے ساتھ ساتھ کے ایچ خورشید صحافت میں بھی گہری دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے بڑے بھائی محمد امین شمیم کے ساتھ مل کر ایک سوشل اخبار شائع کیا جو محدود پیمانے پر تقسیم ہوتا تھا۔ یہ اخبار خصوصاً بچوں کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔ بعدازاں کے ایچ خورشید 1943ء میں ریاست کے نامور صحافی اے آر ساغر کے ہفت روزہ ''جاوید'' سے منسلک ہو گئے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ جب 1944 میں کشمیر تشریف لے گئے تو مسلم سٹوڈنٹس یونین نے ان کے اعزاز میں استقبالیے کا بندوبست کیا۔ یونین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے خورشید حسن نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا تو قائداعظم کی مردم شناس نظریں مسٹر خورشید حسن پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ خورشید حسن کے اندر چھپی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انہیں قائداعظم نے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بننے کی پیش کش کی۔ اس وقت خورشید حسن کی عمر 20 سال تھی۔ یوں ریاست جموں کشمیر کے اس ہونہار طالبعلم کو قائداعظمؒ کی ہمراہی کا شرف حاصل ہوا۔

قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے مسٹر خورشید نے تحریکِ پاکستان کے انتہائی اہم دور کو بہت قریب سے دیکھا۔ لارڈ پیتھک لارنس کی قیادت میں 1946ء میں کیبنٹ مشن کی آمد۔ 1946ء میں مسلم لیگی اور کانگریسی لیڈروں کی برطانیہ روانگی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے انتقالِ اقتدار کے مذاکرات، غرض 1944ء سے لے کر ستمبر 1947ء تک تحریکِ پاکستان کے ہر معمولی و غیر معمولی موڑ پر کے ایچ خورشید قائدِ اعظم کے دستِ راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ برِ عظیم کے اس عظیم قائد کے ساتھ مسٹر خورشید حسن روزانہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے رہے۔ قائداعظم اور ان کے جاں فروش سیکرٹری کی یہی شب و روز کی کاوشیں قیامِ پاکستان کا اولین سبب ٹھہریں۔ قائداعظم نے یہ جو فرمایا تھا ''پاکستان میں نے، میرے ٹائپ رائٹر نے اور میرے سیکرٹری نے بنایا ہے''۔ اس سیکرٹری سے مراد مسٹر خورشید حسن ہی تھے۔ قائدِ اعظم کو اپنے اس معتمدِ خاص پر مکمل اعتماد تھا۔ ایک بار مولوی محمد حسن قائدِ اعظم سے اپنے بیٹے کی خیریت دریافت کرنے آئے تو قائدِ اعظم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

"Don't worry Khurshid will be a great man"

1946ء میں سری نگر میں مسٹر خورشید حسن کی والدہ کا انتقال ہو گیا..... جس کی خبر انہیں بروقت مل گئی۔ قائدِ اعظم نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی لے دیا لیکن انہوں نے قائدِ اعظم کو اس مشکل وقت میں تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا اور کشمیر واپس نہ گئے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ جب مسٹر خورشید قائدِ اعظم کے سیکرٹری بن کر ہندوستان آنے لگے تو انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا تھا۔ ''میں اب اس وقت کشمیر واپس آؤں گا جب پاکستان بن جائے گا''۔ کے ایچ خورشید نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔ چنانچہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد 30 ستمبر 1947ء کو قائدِ اعظم کی اجازت سے اپنے گھر سری نگر چلے گئے۔

سری نگر پہنچنے کے چند روز بعد انہیں یکم نومبر 1947ء کو گرفتار کر لیا گیا لیکن دوسرے ہی روز رہا کر دیا گیا چند روز بعد دوبارہ بلاوجہ گرفتار کر لیا گیا اور قید کی طویل سزا سنا کر کچھ عرصہ سری نگر جیل میں اور بعدازاں رام نگر جیل میں پابہ سلاسل رکھا گیا۔ رام نگر جیل میں ہی 11 ستمبر 1948ء کو انہوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی المناک وفات کی خبر سنی تھی۔ خورشید حسن اس خبر کو زندگی کی بدترین خبر کہا کرتے تھے۔ بالآخر 13 ماہ بعد دسمبر 1948ء کو رہائی نصیب ہوئی جنوری 1949ء کو دیگر کشمیری لیڈروں کے ہمراہ جلاوطن کر کے پاکستان بھیج دیئے گئے۔

پاکستان میں آ کر کے ایچ خورشید شعبہ صحافت سے منسلک ہو گئے اور مشہور صحافی عزیز بیگ کے تعاون سے ہفت روزہ "Guardian" کا اجراء کیا۔ گارڈین قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہونے والا پہلا انگریزی اخبار تھا جس میں حکومتِ وقت کی آمرانہ پالیسیوں پر سخت تنقید کی جاتی تھی۔ اخبار کی حق گوئی نے اسے بے حد مقبول بنا دیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ''گارڈین'' بند ہو گیا کیونکہ مرکزی حکومت نے صحافت میں دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات و نشریات تھے وہ ملک کے نامور صحافیوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ حریت پسند صحافیوں نے ''آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس'' کے نام سے ایک تنظیم بنالی جس میں حمید نظامی، فیض احمد فیض، آغا شورش کاشمیری، زیڈ اے سلہری، عزیز بیگ اور کے ایچ خورشید پیش پیش تھے۔ اس تنظیم کے پہلے صدر فیض احمد فیض تھے جب کہ کے ایچ خورشید کو سیکرٹری جنرل بنایا گیا، کے ایچ خورشید نے بڑی محنت سے اس تنظیم میں کام کیا۔ اسی دوران لیڈرز ایکسچینج پروگرام کے تحت خورشید حسن اور ابو سعید بزمی حکومتِ امریکہ کی دعوت پر امریکہ گئے۔

مسٹر کے ایچ خورشید کے مستقبل کے بارے محترمہ فاطمہ جناح بہت متفکر رہتی تھیں چنانچہ امریکہ سے واپسی پر محترمہ نے خورشید حسن کو مشورہ دیا کہ وہ فی الحال سیاست میں دلچسپی نہ لیں، پہلے تعلیم مکمل کر لیں۔ ساتھ ہی انہوں نے تمام تعلیمی اخراجات خود برداشت کرنے کا یقین دلایا۔ چنانچہ کے ایچ خورشید برطانیہ چلے گئے اور بارایٹ لاء کے لیے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا۔ انہی دنوں پاکستان کے وزیرِ خارجہ ظفر اللہ خاں اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر کی وکالت کر رہے تھے انہوں نے لندن سے مسٹر خورشید کو مشورے کے لیے بلایا۔

1954ء میں کے ایچ خورشید برطانیہ سے بارایٹ لاء کی ڈگری لے کر واپس پاکستان آئے اور کراچی میں انہوں نے اے کے بروہی اور آئی آئی چندریگر کے ساتھ وکالت شروع کر دی۔ چند ماہ ان کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے رہے لیکن اپنی قابلیت کی بدولت جلد ہی اپنے الگ دفتر میں کام شروع کر دیا۔ 1955ء میں ''تحریکِ تعمیرِ ملی'' کا آغاز ہوا تو مسٹر کے ایچ خورشید کو اس کا سیکرٹری جنرل بنایا گیا۔ 1956ء میں وہ حکومتِ آزاد کشمیر کے پبلسٹی ایڈوائزر مقرر ہوئے۔ 1958ء میں چوہدری غلام عباس کی کوششوں سے کشمیر لبریشن موومنٹ (K.L.M) شروع ہوئی تو انہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 2 جون 1958ء کو دیگر قائدینِ تحریک کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کرنے جا رہے تھے کہ کوہالہ پل پر گرفتار کر لیے گئے۔ پھر 6 ماہ بعد گھوڑا گلی سب جیل سے رہا ہوئے۔ اس وقت ایوب خاں پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر چکے تھے۔ سردار محمد ابراہیم خاں کو آزاد کشمیر کی صدارت سے الگ کر دیا گیا۔ چنانچہ 1958ء کے ''رولز

آف برنس" کے تحت مسٹر کے ایچ خورشید کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کیا گیا۔ انہوں نے یکم مئی 1959ء کو بطور صدر آزاد کشمیر حلف اٹھایا۔

کے ایچ خورشید سے قبل آزاد کشمیر ایک بے آئین اور بد نظام خطہ تھا۔ یہاں رہنے والے اپنے آپ کو لاوارث اور یتیم سمجھتے تھے۔ قبل ازیں مسلم کانفرنس کے 13 سالہ دور میں وزارتِ امورِ کشمیر کے کلرکوں نے یہاں کے حکمران اور رعایا دونوں کو گداگر اور طفیلی بنا دیا تھا۔ ایک طرف وزارت اسی شخص کو صدر بناتی جو ان کا منظورِ نظر ہوتا۔ دوسری طرف وزراء کا چناؤ بھی وہی کرتی اور خدمت گذاری کے عوض انہیں 50 روپے ماہانہ وظیفہ دیتی۔ بجٹ، نظامِ حکومت اور تعمیر و ترقی کیا ہوتی ہے؟ حکمران اور عوام دونوں اس سے نا آشنا تھے۔ وزارت کا سیکرٹری جب مری سے کراس کرآتا تو مظفر آباد میں بیٹھے آزاد کشمیر کے صدر پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ وہ بمعہ وزراء کو ہالہ پل پر پہنچ کر سیکرٹری کی خدمت میں سلام تعظیم بجالاتا۔

کے ایچ خورشید نے ایوانِ صدر میں قدم رکھتے ہی عزت و وقار کا نعرہ بلند کیا۔ آزاد کشمیر کے عوام کو کاسہ گدائی توڑ کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا درس دیا۔ حکومت کا انداز یکسر بدل گیا۔ اب آزاد کشمیر کی حکومت یہاں کے عوام کی فلاح و خدمت کا مشن لے کر آگے بڑھی۔ قومی غیرت اور انسانی شعور کو پروان چڑھنے کا موقع میسر آیا۔ کے ایچ خورشید نے آزاد کشمیر میں بنیادی جمہوری نظام رائج کیا۔ چنانچہ آزاد کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار 2400 کونسلرز کے چناؤ کے لیے 1960ء میں انتخابات ہوئے۔ انہی کونسلرز نے 17 اکتوبر 1961ء کو آزاد کشمیر کے پہلے صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ ان انتخابات میں کے ایچ خورشید کو کامیابی حاصل ہوئی اور انہیں آزاد کشمیر کے پہلے منتخب صدر کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1962ء میں آپ نے "جموں کشمیر لبریشن لیگ" کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی جس نے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر کی نمائندہ اور ذمہ دار حکومت تسلیم کرنے کا نظریہ پیش کیا۔

کے ایچ خورشید نے اپنے دورِ صدارت میں جو تاریخ ساز جدوجہد کی اس کے نمایاں پہلو حسبِ ذیل تھے۔

بنیادی جمہوریتوں کا نظام، انتخابی نظام کا قیام، تعمیر و ترقی کے منصوبہ جات، پنج سالہ منصوبہ جات، زرعی اصلاحات، جاگیرداری نظام کا خاتمہ، سٹیٹ کونسل کا قیام اور نظریہ تسلیم کشمیر کا فروغ۔

کے ایچ خورشید کے یہ انقلابی اقدامات وزارتِ امورِ کشمیر کے دل میں کانٹے بن کر چبھنے لگے۔ وزارتِ امورِ کشمیر کے سازشی عناصر کا کردار بڑا نمایاں تھا۔ چنانچہ جب صدر ایوب سے ان کے اختلافات بڑھ گئے تو وہ 15 اگست 1964ء کو مستعفی ہو کر کراچی چلے گئے۔ ایوب خاں اور فاطمہ جناح کے انتخابی معرکے میں انہوں نے محترمہ کے چیف پولنگ ایجنٹ کی ذمہ داری سرانجام دی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ سے ایک ماہ قبل ایک روز مسٹر کے ایچ خورشید کو راولپنڈی میں میرواعظ مولانا یوسف شاہ کے گھر سے اچانک اغواء کر کے پلندری جیل میں محبوس کر دیا گیا۔ چند روز بعد انہیں دولائی کیمپ مظفر آباد میں منتقل کر دیا گیا۔ بالآخر 13 فروری 1966ء کو انہیں دلائی کیمپ سے رہا کیا گیا۔ رہائی کے بعد کے ایچ خورشید سیاستِ کشمیر میں پوری طرح سرگرمِ عمل ہو گئے۔ چنانچہ 1969ء میں انہوں نے لبریشن

لیگ کے پلیٹ فارم سے جمہوری نظامِ حکومت کے قیام کے لیے ایک زبردست تحریک شروع کی۔ تحریک کا مقصد آزاد کشمیر میں سٹیٹ کونسل کی بجائے ایک منتخب قانون ساز اسمبلی قائم کرنا تھا۔ کے ایچ خورشید کی یہ تحریک بہت کامیاب ہوئی۔ بالآخر یحیٰی خاں نے قانون ساز اسمبلی کے قیام کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

1973ء میں کے ایچ خورشید نے برطانیہ کا تاریخ ساز دورہ کیا۔ اس دورے میں انہوں نے برطانیہ کے کونے کونے میں آباد کشمیریوں تک آزادی کا پیغام پہنچایا اور برطانوی ارکانِ پارلیمنٹ سے ملاقاتیں کر کے انہیں مسئلہ کشمیر کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت تھی۔ بھٹو کے ایچ خورشید سے دوستانہ مراسم تھے۔ اس نے خورشید صاحب کو یقین دلایا کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر کام کریں تو ہم مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس کا اصرار تھا کہ لبریشن لیگ کو پیپلز پارٹی میں مدغم کر دیا جائے چنانچہ بھٹو کی یقین دہانی پر کے ایچ خورشید نے 1976ء میں لبریشن لیگ کو پیپلز پارٹی میں ضم کر دیا۔ 1977ء میں چلنے والی "تحریکِ نفاذِ نظامِ مصطفیٰ" کے نتیجے میں بھٹو کی حکومت ختم کر کے جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد کے ایچ خورشید نے دوبارہ لبریشن لیگ کو بحال کر کے منظم کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لائی دور میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن کے ایچ خورشید نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اپنی سرگرمیاں بلا خوف و خطر جاری رکھیں۔ 1984ء میں انہوں نے برطانیہ اور امریکہ کا دورہ کیا۔ اس موقع پر انہوں نے تحریکِ آزادی کشمیر کی بین الاقوامی سطح پر بھرپور نمائندگی کی۔

1985ء میں قانون ساز اسمبلی کے عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں کے ایچ خورشید مہاجرینِ کشمیر کی نشست کے لیے لاہور کے انتخابی حلقے سے بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ مسلم کانفرنس نے مجموعی طور پر زیادہ نشستیں حاصل کیں چنانچہ وہ حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ ادھر اپوزیشن کی جماعتوں نے متفقہ طور پر کے ایچ خورشید کو قائدِ حزبِ اختلاف مقرر کیا۔ انہوں نے اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف کا تاریخی کردار ادا کیا۔

جولائی 1986ء میں کے ایچ خورشید نے برمنگھم میں منعقدہ آل پارٹیز کشمیر کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس میں 12 کشمیری جماعتوں نے شرکت کی۔ کے ایچ خورشید کی کوششوں سے کانفرنس میں شریک تمام جماعتوں نے ایک مشترکہ اعلامیے پر دستخط کیے۔ انہی دنوں ہرارے میں غیر جانبدار ممالک کی آٹھویں سربراہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ کے ایچ خورشید نے موقع غنیمت جانا اور ہرارے پہنچ گئے۔ وہاں انتہائی رازدارانہ انداز سے کانفرنس میں شریک ہوئے اور خود اپنے ہاتھوں سے ایک تاریخی میمورنڈم ٹائپ کر کے 101 ممالک کے نمائندوں میں تقسیم کیا۔ اس سے دنیا مسئلہ کشمیر کے حقیقی تناظر سے آگاہ ہوئی۔

1987ء میں آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس کی زیرِ نگرانی بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں جو وسیع پیمانے پر دھاندلی ہوئی اس کے خلاف حزبِ اختلاف کی تمام سیاسی جماعتوں نے "تحریک بحالی جمہوریت" کے نام

سے ایک احتجاجی تحریک شروع کی۔ تحریک کے زبردست عوامی دباؤ سے حکومت بوکھلا اٹھی۔ عوامی اتحاد نے فیصلہ کیا کہ 23 مارچ 1988ء کو دھاندلی کی پیداوار حکومت کے خلاف لانگ مارچ ہوگا اور 24 مارچ کو متوازی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ 10 مارچ کو میرپور میں وکلاء کنونشن منعقد ہوا جس میں مسٹر کے ایچ خورشید بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ انہوں نے کنونشن میں جو تاریخی خطاب کیا وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ یہ ان کی زندگی کا آخری خطاب تھا لیکن کسی کو کیا علم؟ انہوں نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''انسان آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان کے اصول ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جو لوگ اصولوں کی خاطر زندہ رہتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی خاطر جدوجہد کرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں''۔

''تاریخ میں ایک عظیم لانگ مارچ ماؤزے تنگ کی قیادت میں ہوا تھا۔ 23 مارچ کو ہمارا لانگ مارچ تاریخ کا رخ پھیر دے گا۔ ہم تاریخ میں نام پیدا کریں گے، ہماری قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ہماری قربانیاں آئندہ آنے والی نسلوں کو آزادی، محبت، مساوات، امن اور عدل و انصاف کا سبق دیں گی اور اسلامی جمہوری اصولوں پر گامزن معاشرہ پیدا کرنے میں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کریں گی''۔

میرپور سے گیارہ مارچ کو کے ایچ خورشید پچھلے پہر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ دوستوں نے مزید ٹھہرنے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن وہ ہر حال میں لاہور پہنچنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنے اہلِ خانہ سے 11 مارچ کو واپس آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ گجرات تک انہوں نے اپنے ایک پارٹی کارکن راجہ بسی محمد کے ہمراہ ان کی گاڑی میں سفر کیا۔ گجرات پہنچے تو راجہ بسی محمد کو گھر جانے کی اجازت دے کر خود مسافر وین پر بیٹھ گئے۔ گوجرانوالہ بائی پاس سے گزرتے ہوئے تیز رفتار ویگن کو ڈرائیور نے سڑک کے کنارے کھڑی ٹرالی سے ٹکرا دیا اور خود چھلانگ لگا کر بھاگ گیا۔ یہ ڈرائیور وزیرآباد سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کے ایچ خورشید چونکہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اس لیے جاں بر نہ ہو سکے اور ہسپتال پہنچ کر دم توڑ گئے۔ آپ کی نماز جنازہ 12 مارچ کو لاہور میں اور پھر 13 مارچ کو مظفرآباد میں ادا کی گئی۔ آخری وصیت کے مطابق آپ کو مظفرآباد میں دفن کیا گیا۔

اے قلبِ شناسا ماتم کر، اے چشمِ بینا سوگ منا
جو روشنی بانٹنے آیا تھا وہ چاند وہ سورج ڈوب گیا

کوئی بھی شخصیت جاہ و اقتدار یا مال و متاع کے انبار سے زندہ نہیں رہتی بلکہ افکار و کردار کی عظمت ہی اسے حیاتِ جاوداں بخشتی ہے، کے ایچ خورشید نے ساری زندگی عزم و ہمت اور جرأت و بیباکی سے گزاری۔ انہوں نے نہ ہی گھر بار کی فکر کی اور نہ ہی مال و دولت جمع کیا۔ وہ ریاست جموں کشمیر کے عوام کے لیے افکار و کردار کا ایک ایسا روشن راستہ متعین کر گئے جس پر چل کر ہی یہ محکوم قوم غلامی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ اس دورِ زوال میں ان کی سیاسی زندگی ان کی عظمت کی گواہ ہے۔

آج سیاست کی قبا شہرت پرستی، انا پرستی، جھوٹ، مکر و فریب، بدعہدی، بے ضمیری، تن پرستی، بداخلاقی اور بے قاعدگی کی آلودگی میں لتھڑی ہوئی ہے۔ آج کل نت نئے جنم لینے والے بے شعور سیاست کار قدم قدم پر خود کو بیچتے اور ضمیر کو فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کے ایچ خورشید کی سیاسی زندگی ان آلودگیوں سے بالکل پاک تھی۔ وہ سیاست کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے اصولوں کو مکر و فریب اور مصلحت کوشی کی بھینٹ کبھی نہیں چڑھایا۔ ان کے نزدیک سیاست میں گرگٹ کی طرح روز روز رنگ بدلنا، مانگے تانگے کے اصولوں کا سہارا لینا اور ہر جائز و ناجائز ذرائع سے قومی دولت کو لوٹ لوٹ کر تجوریاں بھرنا محبِ وطن سیاست دان کے لیے ہرگز جائز نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے۔ کسی قسم کے لالچ یا دباؤ میں نہ آئے۔ اس مردِ درویش نے اقبال کے مردِ مومن کی سچی تصویر بن کر زندگی گزاری۔ ساری عمر فاقہ مستی اور درویشی میں بسر کی۔ نہ اپنا کوئی گھر بنایا، نہ جائیداد بنائی، نہ زمین خریدی، نہ کوئی بینک بیلنس رکھا۔ ان کا سرمایہ زیست وہ لمحات تھے جو انہوں نے قائدِ اعظم کی معیت میں گزارے۔ آج قائدِ اعظم کو دور سے ایک نظر دیکھنے والے بھی اپنے آپ کو ''قائدِ اعظم کا سپاہی'' لکھواتے اور لکھتے ہیں۔ نظریہ پاکستان کی الف، ب سے ناواقف لوگ نظریہ پاکستان کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ قائدِ اعظم کے ساتھ اپنے تعلق کو کچے دھاگے سے باندھ کر فرضی قصے اور روائتیں بنا بنا کر قائد کے دیس اور اس کے عوام کی دولت سے اربوں اور کھربوں کی جائیدادیں بنا رہے ہیں۔ فرضی قصیدے اور بے بنیاد تاریخیں لکھواتے ہیں۔ لیکن قائدِ اعظم کے شانہ بشانہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تحریکِ پاکستان میں کام کرنے والے اس بے لوث اور بے غرض نوجوان نے اپنے زندگی کے حسین لمحات قائدِ اعظم کے مشن پر قربان کیے اور پھر ساری زندگی اپنی زبان سے کوئی ایسا لفظ ادا نہ کیا جس کا مقصد قائدِ اعظم کے ساتھ اپنے تعلق کو ثابت کر کے اپنی ذات کو مالا مال کرنا ہو۔ اُس انسان کی عظمت کی یہی دلیل کافی ہے کہ وہ ایک معمولی وین میں سفر کرتا ہوا جامِ شہادت نوش کر گیا۔

ریاست جموں و کشمیر کے محکوم عوام کے لیے خورشیدِ ملت نے چومکھی لڑائی لڑی۔ ایک طرف ان کا دل ریاست جموں کشمیر کے مفاد پرست اور بے شعور سیاست کاروں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا، جن سے ان کا ہر وقت پالا پڑا رہتا دوسری طرف وہ اپنے وطن پر غیر ملکی فوجی قبضے کے خلاف بین الاقوامی پلیٹ فارم پر جنگ لڑتے رہے تیسری طرف انہوں نے ریاستی عوام میں فکر و کردار کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے شب و روز کام کیا، چوتھی طرف ریاست جموں کشمیر سے باہر آباد کشمیریوں کے حقوق کے لیے اور ان کے مستقبل کے لیے تگ و دو کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ وہ ریاست کے بٹے ہوئے خطوں میں یکساں مقبول تھے۔ کے ایچ خورشید گلگت بلتستان، آزاد کشمیر، مقبوضہ کشمیر اور مہاجرینِ کشمیر مقیم پاکستان کے درمیان ایک رابطہ پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ کے ایچ خورشید کا سب سے بڑا اعزاز و افتخار یہ ہے کہ انہوں نے کشمیر کی نئی نسل کو آزادی اور حقِ خود ارادیت کا حقیقی مفہوم سمجھایا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

پنڈت پریم ناتھ بزاز

(1900ء-1984ء)

پنڈت پریم ناتھ بزاز 1900ء کو سری نگر کے موضع سوناواری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ریاستی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ 1927ء میں ایس پی کالج سری نگر سے بی اے کرنے کے بعد پریم ناتھ بزاز نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی لیکن ملازمت ان کی آزاد منش طبیعت کو راس نہ آئی کیونکہ ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ 1930ء کو ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور سیاسی وسماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ 1931ء کو کشمیری پنڈتوں کی جماعت سناتن دھرم یوک سبھا کا صدر نامزد کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں کشمیری پنڈت آپ کو اپنا نمائندہ سمجھنے لگے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے جب گلانسی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا تو پنڈت پریم ناتھ بزاز کو وادی کشمیر کے غیر مسلموں کے نمائندے کی حیثیت سے اس کمیشن میں بطور ممبر نامزد کیا گیا۔ اس کمیشن میں آپ نے نہایت جرأت مندانہ اور مثبت کردار ادا کیا۔ پنڈتوں نے آپ کو کمیشن سے علیحدگی اختیار کرنے پر بہت زور دیا لیکن آپ نے تعمیری جذبے کے تحت ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔

1932ء میں انہوں نے ''وتستا'' کے نام سے سری نگر سے ایک اردو اخبار جاری کیا۔ یہ وادی کشمیر سے شائع ہونے والا پہلا اخبار تھا۔ اس اخبار کی روش بڑی آزادانہ اور جرأت مندانہ تھی۔ 1934ء میں یہ اخبار بعض وجوہات کی بناء پر بند ہو گیا۔ 1935ء میں بزاز نے شیخ عبداللہ کے تعاون سے سری نگر سے ایک اور اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا۔ ریاست کی صحافتی تاریخ میں ''ہمدرد'' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس دور میں ''ہمدرد'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کے لیے پنڈت پریم ناتھ بزاز نے بنیادی کردار ادا کیا۔ 1939ء میں جب نیشنل کانفرنس قائم ہوئی تو پنڈت جی بھی اس میں شامل ہو گئے اور مجلسِ عاملہ کے رکن بنے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب نیشنل کانفرنس کا جھکاؤ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی طرف ہونے لگا تو پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اس جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور آل انڈیا ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایم این رائے اس جماعت کے سربراہ تھے۔ تھوڑے عرصے بعد وہ اس جماعت سے بھی الگ ہو گئے اور انہوں نے جمہوریت اور سوشلزم کے فروغ کے لیے اپنی الگ جماعت ''کشمیر سوشلسٹ پارٹی'' قائم کی۔ 1943ء میں بزاز نے ہمدرد کو ڈیلی اخبار میں بدل لیا۔ وہ اب تصنیف وتالیف کا کام بھی کرنے لگے۔ اسی سال ان کی کتاب ''گاندھی ازم'' جناح ازم اور سوشلزم'' شائع ہوئی۔

1945ء میں شیخ عبداللہ کی پالیسیوں کے سبب نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کرنے والے بہت سے سیاسی کارکنوں نے ''کسان مزدور کانفرنس'' کی بنیاد رکھی۔ چونکہ یہ جماعت کمزور اور پسماندہ طبقوں کی ترجمانی کے لیے

گئی تھی۔ عبدالسلام یا تو اس کے صدر تھے۔ بزاز اس جماعت کے پروگرام اور پالیسی سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہو گئے۔ بعدازاں اس جماعت کی ساری باگ ڈور بزاز کے ہاتھ میں آ گئی۔ بزاز کی مساعیٔ جمیلہ سے یہ جماعت کشمیر کے کسانوں، مزدوروں اور دیگر پسے ہوئے طبقوں کی ترجمان بن گئی۔ 1946ء میں جب شیخ عبداللہ نے ''کشمیر چھوڑدو'' تحریک چلائی تو بزاز نے اس کی کھل کر مخالفت کی اور شیخ عبداللہ کے عزائم کو بے نقاب کیا۔ رفتہ رفتہ نیشنل کانفرنس بزاز صاحب کو اپنے راستے میں رکاوٹ خیال کرنے لگی چنانچہ کانفرنس کے چند غنڈوں نے 10 اپریل 1947ء بزاز پر اس وقت حملہ کر دیا جب وہ دفتر سے واپس گھر آ رہے تھے۔ حملہ آوروں نے ان پر گولیاں برسائیں جس سے شدید زخمی ہو گئے۔ کئی روز تک موت وحیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد بالآخر وہ صحت یاب ہو گئے۔ 1947ء میں تقسیم ہند کا منصوبہ سامنے آنے کے بعد بزاز نے مہاراجہ ہری سنگھ کو مشورہ دیا کہ ریاست کو اگر آزاد رکھنے کے بجائے دونوں ملکوں میں سے کسی ایک سے الحاق کرنا ہو تو پاکستان سے الحاق کو ترجیح دی جائے اس سلسلے میں لوگوں سے بھی رائے لی جائے۔ اس نظریے کی پاداش میں بزاز کو 22 اکتوبر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور تقریباً تین سال تک جموں کے گرم ترین مقامات پر زندان خانوں میں رکھا گیا۔ رہائی کے بعد شیخ عبداللہ کی حکومت نے انہیں جبری طور پر جلاوطن کر کے ہندوستان بھیج دیا۔ دہلی میں جلاوطنی کے ایام میں اگرچہ وہ عملاً سیاسیاتِ کشمیر میں حصہ نہ لے سکے لیکن فکری اور قلمی طور پر انہوں نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی لڑائی جاری رکھی۔ ان کی تصانیف انگریزی میں ہیں۔ آخری عمر میں وہ دہلی سے ایک رسالہ بھی شائع کرتے رہے۔ بالآخر وطن سے دور وطن کا یہ عاشق 7 جولائی 1984ء کو وفات پا گیا۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز کشمیر کی سیاست وصحافت میں بلند مقام رکھتے ہیں وہ ایک آزاد، روشن خیال، غیر متعصب اور جمہوری مملکت جموں کشمیر کا قیام عمل میں لانا چاہتے تھے لیکن سیاست کے میدان میں جب وہ اپنے اس خواب کو حقیقت میں نہ بدل سکے تو انہوں نے کشمیر کی سیاست اور تاریخ پر قلم اٹھایا اور گراں قدر تصانیف رقم کیں۔ ان کی سب سے اہم اور شہرہ آفاق تصنیف "The History of struggle for freedom in Kashmir" ہے۔ یہ کتاب 1954ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ بعدازاں 1976ء میں پاکستان سے بھی شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ریاست جموں کشمیر کے مایہ ناز فرزند عبدالحمید نظامی نے کیا جسے ویری ناگ پبلشرز میرپور نے 1992ء میں شائع کیا۔

اس کتاب کے آخری باب کا عنوان ہے ''کچھ مستقبل کے بارے''۔ اپنے وطن کے مستقبل کا خاکہ کھینچتے ہوئے بزاز نے 1955ء میں جو نقشہ کھینچا تھا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

''میں اپنے طور اور میری طرح اندازِ فکر رکھنے والے تمام لوگوں کی طرف سے کہتا ہوں کہ مسئلہ الحاق کا فیصلہ کچھ بھی ہو، ہمیں صرف یہ دیکھنے کی تمنا ہے کہ کشمیر برِعظیم میں ایک ایسی خود مختار اکائی کی حیثیت سے ترقی وعروج حاصل کرے جہاں کے باشندوں کو مکمل آزادی یعنی سیاسی، سماجی، اقتصادی، فکری وذہنی اور روحانی لحاظ سے پوری آزادی نصیب ہو۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کشمیر ایک بار پھر علم وفن، تہذیب وتمدن کا گہوارہ، امن کا مسکن، وطن کے فرزندوں کی

مان اور ستم دیدہ ایذا رسیدہ مظلوم انسانوں کی مذہب، رنگ اور قومیت کی تفریق کے بغیر پناہ گاہ بن جائے۔

ہم ایسا کشمیر چاہتے ہیں جہاں ہر شخص کوئی ڈر یا خوف محسوس کیے بغیر سوچ سکے اور زندگی گزار سکے۔ جہاں اُسے اپنی ترقی کے لیے پورے مواقع حاصل ہوں۔ جہاں انفرادی صلاحیتوں کے ابھرنے پر کوئی احتساب نہ ہو۔ جہاں لوگوں کو اپنے آپ پر پورا اعتماد ہو اور وہ کسی دیکھی یا ان دیکھی طاقت کے سہارے کی آس نہ لگائے ہوئے ہوں۔ جہاں کوئی مذہبی، نسلی اور اعتقادی تعصبات دلوں کو مسموم نہ کرتے ہوں۔ جہاں فکر و عمل کی دلیل راہ معقولیت پسندی ہو۔ جہاں عورت کو غلامی کے بندھنوں سے آزاد کیا جا چکا ہو۔ جہاں مخصوص مراعات حاصل کرنے والے طبقے اور فرقے نہ ہوں۔ جہاں تعلیم سب کے لیے مفت اور عام ہو۔ جہاں مذہب کو رعایت کی مہر نہ سمجھا جائے۔ جہاں انسان کو سماجی اور سیاسی حقوق سے مستفید ہونے کے لیے پیدائش کے امتیاز کو روا نہ رکھا جائے۔ جہاں ہر مرد اور عورت کو ترقی کرنے کا موقع حاصل ہو۔ جہاں سرمایہ پرست اور مخصوص مفادات محنت کشوں کو لتاڑتے نہ ہوں۔ جہاں سیاسی تعلیاں عوام کی لوٹ کھسوٹ کا باعث نہ بنتی ہوں۔ جہاں جہالت کے بل بوتے پر ملاؤں اور مذہبی جنونیوں کو فروغ حاصل نہ ہو۔ جہاں عقائد، فہم و فراست کی وقعت نہ گھٹاتے ہوں، جہاں افلاس ماضی کی بات ہو اور عوام اچھا کھاتے ہوں، اچھا پہنتے ہوں، اچھی رہائش رکھتے ہوں اور پوری طرح سیر چشم ہوں۔

ہم ہر کشمیری کو سچائی کا متلاشی، علم کا پیاسا، ظن تخمین اور تجسس کا مادہ رکھنے والا اور اس کے ساتھ ہی ہر قسم کے خیالات کے ساتھ یہ خواہ اس کے لیے کتنے ہی ناقابلِ قبول کیوں نہ ہوں، رواداری برتنے والا فرد دیکھنا چاہتے ہیں''۔

(تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر صفحہ 723)

پنڈت پریم ناتھ بزاز کی دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں۔

"Inside Kashmir"

"Azad Kashmir"

"Trouth about Kashmir"

(عبدالاحد آزاد) شاعر انسانیت

"The shadow of Ram Rajia over India"

"Kashmir in Crucible"

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کشمیر کی سیاست اور صحافت میں ایک نئے دور کی بنیاد رکھی۔ انہیں اس نئے دور کا پیامبر کہا جاتا ہے۔

کشمیر کے نامور قلم کار و مدبر اور دانشور محمد یوسف ٹینگ نے کشمیر کے اس مایہ ناز سپوت کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ سرزمین کشمیر اپنے اس باعزم اور روشن دماغ سپوت کو فراموش نہ کر پائے گی۔ آنے والا یگ اسی کا ہے۔ علامتوں میں بات کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے دور میں تزک بھڑک والا حاکم زینت طاق نسیاں ہو جائے گا اور پریم ناتھ بزاز دل و دماغ میں اجالا کرتا رہے گا''۔



خواجہ غلام نبی گلکار

(1909ء - 1973ء)

خواجہ غلام نبی گلکار انور سری نگر میں مارچ 1909ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ محمد خضر تھا۔ جن کا پیشہ ''گلکاری'' تھا۔ اسی مناسب سے خواجہ صاحب ''گلکار'' کہلائے۔ 12 برس کی عمر میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہوگئے۔ سری نگر شہر کے مقامی دینی مدرسے میں انہوں نے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی پھر اسلامیہ ہائی سکول اور ایس پی سکول میں حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے ایس پی کالج سری نگر سے ایف اے کا امتحان اس وقت دیا جب آپ جیل میں تھے۔ اسی طرح بی اے کا امتحان بھی آپ نے سنٹرل جیل سری نگر میں دیا۔

آپ زمانہ طالبعلمی سے ہی آزادی کشمیر کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ 1930ء میں کسی قسم کا سیاسی جلسہ کرنا یا پارٹی بنانا قانونی طور پر ممنوع تھا چنانچہ آپ نے مسجدوں، دعوتوں، خانقاہوں، میلوں اور دیگر اجتماعات میں جا کر اصلاح احوال اور عوامی بیداری کی تحریک شروع کی۔ ایس پی کالج میں دوران تعلیم آپ کی کاوشوں سے مسلمانوں کی ایک تنظیم ''آل کشمیر مسلم سوشل اپ لفٹ ایسوسی ایشن'' قائم ہوئی جس کے آپ بانی صدر تھے۔ چونکہ ان دنوں کشمیر میں سیاسی جماعت بنانے کی اجازت نہ تھی اس لیے سری نگر کے پڑھے لکھے نوجوانوں نے دارالمطالعہ (ریڈنگ روم) قائم کرنے کا پروگرام بنایا تا کہ نوجوانوں کے مسائل پر مل بیٹھ کر غور و فکر کیا جائے۔ تحریک آزادی کشمیر کے ابتدائی محرکات میں ریڈنگ روم کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ یہیں سے انقلاب کشمیر کی تحریک اٹھی اور پوری ریاست جموں کشمیر میں پھیل گئی۔ خواجہ غلام نبی گلکار اس ریڈنگ روم کے سرکردہ ممبر تھے۔ ریڈنگ روم اور آل کشمیر مسلم سوشل اپ لفٹ ایسوسی ایشن کی ان سرگرمیوں کے سبب اندر ہی اندر ریاست میں انقلاب کا لاوا پکتا رہا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ دورہ یورپ سے واپس کشمیر آنے لگا تو ریڈنگ روم کے نوجوانوں نے خوشامدانہ استقبال کے بجائے اپنا نقطۂ نظر، حقوق اور مطالبات مہاراجہ کے سامنے پیش کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس مقصد کے پیش نظر ریڈنگ روم نے جامع مسجد سری نگر میں ایک جلسۂ عام بلایا، مگر حکومت نے حکمِ امتناعی جاری کر کے جلسے کو روکنے کا حکم دے دیا۔ ریڈنگ روم نے خواجہ غلام نبی گلکار کو حکمِ امتناعی توڑنے کے لیے ڈکٹیٹر مقرر کیا۔ یہ واقعہ 1931ء کا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے جرأت مندی دکھائی اور حکم کو توڑتے ہوئے جامع مسجد سری نگر میں جلسۂ عام میں پُرجوش تقریر کر کے اپنا نقطۂ نظر عوام کے سامنے رکھا۔ 1932ء میں جن لوگوں نے مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں خواجہ صاحب کا کردار نمایاں ہے۔ 13 جولائی 1931ء کے عظیم سانحے کے نتیجے میں 14 جولائی کو شیخ عبداللہ اور غلام نبی گلکار کو حکومت

نے گرفتار کرلیا اور قلعہ ہری پربت میں بند کر دیا۔ اس کے بعد مستری یعقوب علی، سردار گوہر رحمان اور چوہدری غلام عباس گرفتار ہوئے۔ 1931ء کے جلسۂ عام میں آپ نے ہزاروں افراد کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وصیت کی تھی۔

''اگر میں مارا جاؤں یا مر جاؤں تو میری نعش کو بجائے قبرستان کے، کسی ایسے چوراہے پر دفن کر دیا جائے جو آزادی ملنے کے بعد مجاہدین آزادی کی گزرگاہ ہو، تاکہ ان کے گزرنے اور چلنے کی آواز سے میری روح کو تسکین ملے''۔ 1931ء میں جب تحریک زوروں پر تھی تو ڈوگرہ حکومت نے آپ کو لالچ دے کر خریدنا چاہا لیکن چونکہ قومی غیرت کا جذبہ آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لیے آپ نے ہر قسم کے لالچ اور مفاد کو ٹھکرا دیا۔ 1931ء سے 1947ء تک آپ کو چھ بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔

1946ء میں ریاستی اسمبلی پرجا سبھا کے انتخابات ہوئے جس میں آپ سری نگر سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑے، ڈوگرہ حکومت نے آپ کو ہرانے کی بھرپور کوشش کی لیکن آپ ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب جیت گئے۔ 1947ء میں جب ہندوستان سے برطانوی اقتدار ختم ہوا اور 15،14 اگست کو ہندوستان اور پاکستان معرضِ وجود میں آئے تو ڈوگرہ حکومت کے خلاف ریاستی عوام نے بغاوت شروع کر دی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں ایک آزاد انقلابی حکومت قائم کی گئی۔ یہ حکومت 4 اکتوبر 1947ء کو جمہوریہ جموں کشمیر کے نام سے معرضِ وجود میں آئی۔ یہ انقلابی حکومت خواجہ غلام نبی گلکار انور نے قائم کی تھی۔ اس وقت کے ہنگامی حالات میں سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر آپ کا خفیہ نام انور رکھا گیا تھا چنانچہ انور کے نام سے ہی آپ نے ڈوگرہ حکمران ہری سنگھ کو معزول کرنے کا اعلان جاری کیا۔ جس کا مسودہ آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ یہ فرمان کشمیری کارکنوں کے ایک اجلاس منعقدہ پیرس ہوٹل راولپنڈی میں منظور ہوا۔ اس سلسلے میں پانچ اکتوبر 1947ء کو پرشین ہاؤس صدر راولپنڈی میں ایک اور میٹنگ منعقد ہوئی جس میں 100 کے قریب نمائندوں نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ 4 اکتوبر کی نئی آزاد حکومت کی پوری طرح مدد اور حمایت کی جائے گی۔ خواجہ صاحب نے نئی حکومت کا جو اعلان جاری کیا اسے پاکستان اور دنیا کے دیگر اخبارات میں نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اس اعلان کو ریڈیو پاکستان نے بھی نشر کیا۔

آپ نے جو انقلابی حکومت قائم کی اس کے ممبران حسب ذیل تھے۔

سردار محمد ابراہیم خان (وزیر اعظم) مولوی غلام حیدر جنڈالوی (وزیر دفاع) نذیر حسین شاہ (وزیر مال) ڈاکٹر نذیر الاسلام (وزیر تعلیم) ڈاکٹر وزیر احمد قریشی (وزیر صحت و صفائی) عبدالرحیم درانی (سیکرٹری دفاع) ڈاکٹر محمود آف پونچھ (ڈائریکٹر میڈیکل سروسز) خلیفہ عبدالمنان (چیف انجینئر) مسٹر حکیم (انسپکٹر جنرل پولیس) جنرل محمد اکبر کیانی (ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس) مسٹر رحمت اللہ (سیکرٹری ٹرانسپورٹ) خواجہ عبدالغفار ڈار (پبلسٹی آفیسر) سردار گل احمد خان کوثر (چیف پبلسٹی آفیسر)۔

آزاد حکومت تشکیل دینے کے بعد یہ عظیم مجاہد آزادی 6 اکتوبر کو سری نگر کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ مہاراجہ کا تختہ الٹا جا سکے۔ جہاں پر ان کو 14 دسمبر 1947ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ 13 ماہ کی گرفتاری کے بعد رہا ہو کر پاکستان آئے تو آپ نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے خود مختار کشمیر کا نظریہ پیش کیا۔ آپ نے اس نظریے کو بلا خوف و خطر اور وقتی مصلحتوں

سے آزاد ہو کر نہایت جرأت سے پیش کیا۔ آپ کا کہنا تھا:

''ریاست کے ہر فرد و بشر کو حق ہے کہ وہ جو رائے اپنے ملک کے مستقبل کے متعلق دینا چاہے دے سکتا ہے۔ کوئی شخص اسے اس آزادانہ اظہار رائے سے روکنے کا حق نہیں رکھتا''۔ خواجہ صاحب کچھ عرصہ تک مسلم کانفرنس سے وابستہ رہے لیکن مسلم کانفرنس کی تحریک آزادی کے منافی سرگرمیوں سے نالاں ہو کر آپ نے 1956ء کے اوائل میں کشمیر ریپبلکن پارٹی کا قیام عمل میں لایا۔ خود مختار کشمیر کا قیام اس پارٹی کا مطمع نظر تھا۔ اس نظریے کے پرچار کے لیے آپ نے ایک اخبار ''ہمارا کشمیر'' جاری کیا۔ 3 جولائی 1959ء میں حکومتِ پاکستان نے آپ کو نظریہ خود مختار کشمیر اور تقسیم کشمیر کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں گرفتار کر لیا اور جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ 1961ء میں جب کے ایچ خورشید کے دورِ حکومت میں آزاد کشمیر کے پہلے صدارتی انتخابات عمل میں آئے تو خواجہ صاحب واحد کشمیری راہنما تھے جو نظریہ خود مختار کشمیر کے منشور پر الیکشن لڑے۔ 1963ء میں چند باشعور کشمیریوں نے ''کشمیر انڈی پنڈنٹس کمیٹی'' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی۔ اس جماعت کے قیام میں عبدالمجید ملک ایڈووکیٹ، عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ، قاضی خورشید عالم، میر عبدالعزیز، مجید امجد بٹ، ایم اے فاروق، سعید شاہ نازکی، ڈاکٹر غلام احمد جراح، جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالرشید، شیخ محمد اسلم اور خواجہ غلام نبی گلکار نے بنیادی کردار ادا کیا۔ 1965ء میں جب سیالکوٹ کے مقام پر محاذ رائے شماری کا پہلا اجلاس ہوا تو آپ کو محاذ کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ آپ کشمیر کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتے تھے اس مقصد کی خاطر آپ ساری زندگی مصروفِ عمل رہے۔ بالآخر کشمیر کے اس عظیم سپوت نے 1973ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ آپ نے فرمایا تھا:

''میں ریاست کی آزادی اور سالمیت کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے زر دے کر، عہدے کا لالچ دے کر نہیں خرید سکتی البتہ محبت اور دلائل کے ذریعے خریدا جا سکتا ہے۔ باقی رہا مارنا وہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ میں جیل کی دھمکیوں سے نہیں گھبراتا۔ اگر کوئی برسرِ اقتدار حکومت مجھے جیل میں ڈال کر یہ سمجھتی ہے کہ میں اپنے مطالبہ آزادی سے باز رہوں تو یہ اس کی بھول ہے۔ میں نے 1931ء میں کشمیری عوام سے وعدہ کیا تھا کہ میں انہیں کبھی فروخت نہیں کروں گا۔ ان کے حقوق کی حفاظت سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرے نزدیک سیاست میں جھوٹ بولنا جائز نہیں''۔ (بحوالہ ''ہمارا کشمیر'' 25 نومبر 1952ء)

''آخر ہم نے بھی مرنا ہے۔ ہم قیامت کے روز شہداء کی ان پاک روحوں کو کیا جواب دیں گے، اگر ہمارے ارادوں میں ذرا بھر لغزش آئی اور ہم نے اپنے اقتدار کے لیے قومی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دے دی تو قوم اور ملت کے لیے ذلیل ہونا اس عزت سے بدرجہ بہتر ہے، جس سے قوم اور ملک ذلیل ہو''۔

''آزاد کشمیر کے عوام کو ذہن سے یہ بات نکال دینی چاہیے کہ وہ شخصیت پرستی سے کامیاب ہوں گے۔ وہ صرف اصول پرستی سے ہی کامیاب ہوں گے، شخصیتیں آتی اور چلی جاتی ہیں لیکن اصول دیرپا ہوتے ہیں''۔ (سرفروش 16 اکتوبر 1956ء)

محمد مقبول بٹ شہیدؒ

(1938ء - 1984ء)

محمد مقبول بٹ شہیدؒ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ضلع کپواڑہ کی تحصیل ہندواڑہ کے ایک گاؤں تریہگام میں 18 فروری 1938ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غلام قادر بٹ تھا جو محنت پیشہ آدمی تھے۔ مقبول بٹ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ بی اے سینٹ جوزف کالج بارہ مولا سے کیا۔ سکول اور کالج کے زمانے میں مقبول بٹ تحریکی وسماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اس نوجوان کی انہی سرگرمیوں کو دیکھ کر کالج کے عیسائی پرنسپل مسٹر فنکس نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ نوجوان کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے گا یا پھر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

مقبول بٹ نے جب بی اے کا امتحان دیا اس وقت وادی کشمیر شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے سبب شدید ہنگاموں کی لپیٹ میں تھی چنانچہ بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ 1958ء کو اپنے چچا عبدالعزیز کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ پاکستان کے سرحدی محافظوں نے انہیں پوچھ گچھ کے لیے قلعہ مظفرآباد میں نظر بند کر دیا۔ رہائی کے بعد مقبول بٹ پشاور میں سکونت پذیر ہوئے جہاں محبت خان نامی ایک کشمیری کی کاوش سے انہیں پشاور یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ مل گیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ پشاور سے شائع ہونے والے ایک اخبار ''انجام'' میں بھی کام کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ہفتہ وار ''خیبر ویکلی'' رسالہ شروع کیا لیکن اسے مالی مجبوریوں کے سبب جاری نہ رکھ سکے۔ آپ نے پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم صحافت کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1961ء میں ان کی شادی اپنی ایک قرابت دار خاتون راجہ بیگم سے ہوئی جس سے یکے بعد دیگرے دو بیٹے جاوید مقبول اور شوکت مقبول پیدا ہوئے۔ مقبول بٹ نے کے ایچ خورشید کے دورِ صدارت میں 1960ء میں بی ڈی سسٹم کے تحت ہونے والے آزاد کشمیر کے پہلے بلدیاتی انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ 1965ء میں انہوں نے ایک سکول معلمہ ذاکرہ بیگم سے شادی کی جس سے ایک بیٹی لبنیٰ مقبول پیدا ہوئی۔

1965ء میں مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں نے محاذ رائے شماری کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔ اپریل 1965ء میں سیالکوٹ کے مقام پر محاذ کا پہلا کنونشن منعقد ہوا جس میں مقبول بٹ محاذ کے پبلسٹی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کنونشن سے فارغ ہونے کے بعد محاذ کے مرکزی عہدیداروں نے سیالکوٹ اور جموں کے درمیان سوچیت گڑھ کے بارڈر پر جا کر مقبوضہ وطن کی مٹی ہاتھ میں اٹھا کر حلف اٹھایا کہ وہ اس دھرتی کی عزت وآزادی کے لیے جان

کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مقبول بٹ اور ان کے ایک دوست امان اللہ خان نے 13 اگست 1965ء کو محاذ کے ایک خفیہ عسکری ونگ NLF کی بنیاد رکھی جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ کشمیری نوجوانوں کو عسکری تربیت دے کر بھارت کی قابض افواج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کیا جائے۔ مقبول بٹ نے این ایل ایف کے پلیٹ فارم سے کشمیر کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کا نظریہ پیش کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی بلکہ غاصب سے چھین کر لینا پڑتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کشمیری ہتھیار اٹھا کر قابض افواج کے خلاف نہیں لڑیں گے اس وقت تک کشمیر کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔ چنانچہ بھارت کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کرنے کے لیے وہ جون 1966ء میں اپنے چند ساتھیوں میجر امان اللہ خان، صوبیدار کالا خان اور اورنگزیب شہید (گلگت) کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے وادی کشمیر میں داخل ہو گئے جہاں تین ماہ تک وہ خفیہ طور پر تنظیم سازی کرتے رہے اور نوجوانوں کو گوریلا تربیت دیتے رہے۔ بالآخر مخبری ہونے کے سبب وہ اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گئے اور انہیں سنٹرل جیل سری نگر میں قید کر دیا گیا۔ ان کا ایک ساتھی اورنگزیب اس معرکے میں شہید ہو گیا۔ مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ کشمیر ہائی کورٹ کے ایک جج نیل کنٹھ گنجو نے انہیں سزائے موت سنائی۔ مقبول بٹ نے سزائے موت سنانے والے جج کو عدالت کے کٹہرے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ''جج صاحب وہ رسی ابھی تیار نہیں ہوئی جو مقبول بٹ کے لیے پھانسی کا پھندہ بن سکے''۔

انہوں نے دسمبر 1968ء میں اپنے دو ساتھیوں میر احمد اور چوہدری یسٰین کے ہمراہ سری نگر جیل میں سرنگ لگا کر راہِ فرار اختیار کی اور کئی روز تک برف پوش پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد قاضی ناگ چھم کے راستے آزاد کشمیر پہنچ آئے۔ جہاں پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام لگا کر مظفرآباد کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اس قلعہ میں مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کو سخت اذیتیں دی گئی لیکن راہِ آزادی کے ان متوالوں کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ کچھ عرصہ تشدد سے گزرنے کے بعد انہیں رہائی ملی تو پھر تحریکِ آزادی کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ 1969ء میں مقبول بٹ کو محاذ رائے شماری کا مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ 31 جنوری 1971ء کو دو کشمیری نوجوان اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے بھارت کا گنگا طیارہ اغواء کیا اور لاہور لے آئے۔ گنگا کے اغواء سے مقبول بٹ اور ان کے سیکڑوں ساتھیوں کو پاکستان کی مختلف جیلوں اور عقوبت خانوں میں جبر وتشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن ان حریت پسندوں کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ مئی 1973ء میں گنگا کے مقدمہ سے رہائی کے بعد مقبول بٹ پھر سرگرمِ عمل ہو گئے۔ انہوں نے 1975ء میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے لیے ایبٹ آباد اور مری کے حلقوں سے دو نشستوں پر انتخاب لڑا لیکن سیٹ حاصل نہ کر سکے البتہ الیکشن مہم میں انہوں نے اپنے وطن کی آزادی کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ 1976ء میں مقبول بٹ اپنے دو نوجوان ساتھیوں ریاض ڈار اور حمید بٹ کے ہمراہ جدوجہدِ آزادی کو ازسرِ نو منظم کرنے کے لیے ایک بار پھر جنگ بندی لائن توڑتے ہوئے وادی کشمیر میں داخل ہو گئے جہاں ایک معرکے میں انہیں گرفتار کر لیا

گیا۔ گرفتاری کے کچھ عرصہ بعد انہیں تہاڑ جیل دہلی میں منتقل کر دیا گیا جہاں بھارتی سپریم کورٹ نے ان کی سابقہ سزائے موت بحال کر دی اور پھانسی کا فیصلہ سنایا۔ 6 فروری 1984 کو لندن میں بھارتی سفارت خانے کے ایک اہلکار ریوندر مہاترے کو ''کشمیر لبریشن آرمی'' نامی ایک خفیہ تنظیم کے اہلکاروں نے اغواء کر لیا۔ اغواء کاروں نے 24 گھنٹوں کے اندر اندر مقبول بٹ، حمید بٹ، ریاض ڈار اور دیگر کشمیری حریت پسندوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن جب بھارتی حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو اغواء کاروں نے 54 گھنٹے گزرنے کے بعد مہاترے کو قتل کر دیا۔ مہاترے کے قتل کے بعد بھارتی حکومت نے مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا اعلان کر دیا۔ مقبول بٹ کو سزائے موت سے بچانے کے لیے کشمیریوں نے بہت کوششیں کیں لیکن بھارتی حکومت اپنے فیصلے پر کاربند رہی چنانچہ 11 فروری 1984ء کو اتوار کے روز علی الصبح تہاڑ جیل میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے پھندے پر لٹکتے ہوئے مقبول بٹ کے آخری الفاظ تھے ''میرے وطن تو ضرور آزاد ہوگا.....''

مقبول بٹ کی لاش ان کے ورثاء کے حوالے کرنے سے بھارتی حکومت نے انکار کر دیا چنانچہ جیل کے مسلمان قیدیوں نے انہیں وہیں جیل کے احاطے میں دفن کر دیا۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں مقبول بٹ شہید کو سب سے اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ راہ آزادی میں مقبول بٹ کی قربانی نے کشمیریوں کو نیا عزم و حوصلہ عطا کیا۔ بلاشبہ کشمیر کی نئی نسل میں مقبول بٹ کو جو عزت، قدر و منزلت حاصل ہے وہ کسی دوسرے شخص کے حصہ میں نہیں آئی۔ نئی نسل مقبول بٹ کو جدوجہدِ آزادی کا ہیرو سمجھتی ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ مقبول بٹ نے روایتی انداز سے ہٹ کر مصلحتوں اور مفادات کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے صدق و صفاء اور خلوص و وفا کا پیکر بن کر کشمیر کی نئی نسل کو آزادی و خودمختاری کا حقیقی تصور دیا اور اس تصور کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے استقامت و استقلال کی نئی تاریخ رقم کی۔ کشمیری ہر سال اپنے اس عظیم قائد کا یوم شہادت جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ اس سلسلے میں اندرونِ کشمیر اور بیرونِ کشمیر لاتعداد تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

مقبول بٹ شہید نے بھارت اور پاکستان کے عقوبت خانوں سے جو فکر انگیز خطوط لکھے تھے ان کا مجموعہ ''شعورِ فردا'' کے عنوان سے راقم نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ خطوط مقبول بٹ کے فکر و کردار کا حقیقی آئینہ ہیں۔



چوہدری غلام عباس

(1904ء-1967ء)

چوہدری غلام عباس 4 جنوری 1904ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام چوہدری نواب دین تھا۔ جنہوں نے جالندھر سے آ کر جموں کشمیر ریذیڈنسی میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ان کا تعلق رانگڑ قبیلے سے تھا۔ چوہدری غلام عباس نے ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول جموں سے حاصل کی۔ 1921ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے پرنس آف ویلز کالج جموں میں داخلہ لیا۔ 1925ء میں انہوں نے بی اے پاس کیا تو محکمہ قانون میں بھرتی ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یہ ملازمت چھوڑ کر ہائی سکول جموں میں بطورِ معلم بھرتی ہو گئے۔ یہاں بھی طبیعت راس نہ آئی تو ملازمت چھوڑ کر 1929ء میں لاء کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ 1931ء میں انہوں نے قانون کا امتحان پاس کیا۔

چوہدری غلام عباس جس زمانے میں پرنس آف ویلز کالج جموں میں زیرِ تعلیم تھے انہوں نے پہلے سے قائم ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو اپنے چند دیگر ساتھیوں کی مدد سے از سر نو منظم کیا۔ اس سے وہ سماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ 1924ء میں وہ اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ اس انجمن کا کام مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا۔ علاوہ ازیں اس انجمن نے مسلمانوں کو دینِ اسلام کی طرف راغب کرنے اور اپنے حقوق کی طرف متوجہ ہونے کا احساس بھی پیدا کیا۔

1931ء میں جموں میں توہینِ مذہب کے کچھ واقعات پیش آئے۔ ان واقعات کے خلاف ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے چوہدری غلام عباس اور ان کے ساتھیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 13 جولائی 1931 کے عظیم سانحہ کے نتیجے میں ریاست کے جن مسلمان راہنماؤں کو گرفتار کیا گیا ان میں چوہدری غلام عباس بھی شامل تھے۔ 1932ء میں ریاستی مسلمانوں نے آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے نمائندہ سیاسی جماعت قائم کی تو چوہدری غلام عباس اس کے پہلے مرکزی سیکرٹری جنرل منتخب کیے گئے۔ 1939ء میں جب مسلم کانفرنس کا نام بدل کر اسے نیشنل کانفرنس بنا دیا گیا تو چوہدری غلام عباس نیشنل کانفرنس کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ 1942ء میں جموں اور وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے کچھ مخلص راہنماؤں کی کوششوں سے مسلم کانفرنس کا احیاء عمل میں آیا تو چوہدری غلام عباس مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ 1946ء میں نیشنل کانفرنس کی ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کے جواب میں مسلم کانفرنس نے ''فری کشمیر'' کا منشور جاری کیا۔ اکتوبر 1946ء کو ڈائریکٹ ایکشن کے نام سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو چوہدری غلام عباس اور ان کے بہت سے دوسرے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ ان راہنماؤں کو اس وقت رہائی ملی جب

برِ عظیم تقسیم کے عمل سے گزر چکا تھا اور ریاست جموں کشمیر بھی جبراً تقسیم ہو گئی تھی۔ یکم مارچ 1948ء کو چوہدری غلام عباس کو شیخ عبداللہ کی حکومت نے رہا کر کے سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان بھیج دیا۔ حکومتِ پاکستان نے انہیں مہاجرین کی آباد کاری کے معاملات کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے علاوہ آپ کو تحریکِ آزادی کشمیر اور آزاد کشمیر حکومت کا سپریم ہیڈ بھی نامزد کیا گیا۔ لیکن جب وزارت امورِ کشمیر نے جلد ہی ان کا یہ عہدہ ختم کر دیا تو وہ سخت مایوس ہو گئے۔ اور عملی طور پر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ 1958ء میں انہوں نے حکومتِ پاکستان کی کشمیر پالیسیوں سے مایوس ہو کر کشمیر لبریشن موومنٹ شروع کی۔ وہ جنگ بندی لائن عبور کرنے کے لیے راولپنڈی سے کشمیر کی کنٹرول لائن کی طرف جا رہے تھے کہ اپنے ساتھیوں سمیت کوہالہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے۔ اور کئی ماہ تک گرفتار رہے۔ رہائی کے بعد چوہدری صاحب سیاسیات کشمیر سے بالکل کنارہ کش ہو گئے۔ مسلم کانفرنس میں دھڑے بندی اور دن بدن بڑھتے ہوئے انتشار و خلفشار کے سبب وہ جماعتی سیاست سے بھی الگ تھلگ ہو گئے۔

بالآخر وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے۔ راولپنڈی اور لندن میں زیرِ علاج رہنے کے بعد 18 دسمبر 1967ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ چوہدری غلام عباس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ انہیں آزاد کشمیر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ راولپنڈی میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق انہیں راولپنڈی میں فیض آباد کے مقام پر دفن کیا گیا۔

جیسا کہ چوہدری غلام عباس کی آخری وصیت سے عیاں ہے وہ پاکستان کے زبردست شیدائی تھے اور پاکستان کو ہی اپنی منزل مراد سمجھتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے وہ ہمیشہ مصروفِ جدو جہد رہے۔

O

شیخ محمد عبداللہ

(1905ء - 1983ء)

شیخ محمد عبداللہ سری نگر کے ایک قریبی گاؤں "سورہ" میں دسمبر 1905ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام شیخ محمد ابراہیم تھا، جو شالوں کے تاجر تھے۔ شیخ عبداللہ نے ابتدائی تعلیم مقامی پرائمری سکول سے حاصل کی۔ اُنہوں نے 1922ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سری نگر سے میٹرک کا امتحان سائنس مضامین کے ساتھ پاس کیا اور 1924ء میں ایس پی کالج سری نگر سے ایف ایس سی کی سند حاصل کی۔ اس زمانے میں چونکہ ایس پی کالج میں ابھی بی ایس سی کی کلاسز کا اجراء نہیں ہوا تھا، اس لئے وہ بی ایس سی میں داخلہ کے لئے پرنس آف ویلز کالج جموں میں آئے، لیکن یہاں بھی محدود نشستوں کے سبب اُنہیں داخلہ نہ مل سکا۔ چنانچہ وہ لاہور آ گئے اور یہاں اسلامیہ کالج میں اُنہیں داخلہ مل گیا۔ چنانچہ 1926ء میں اُنہوں نے اسلامیہ کالج سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور ایم ایس سی کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اُنہوں نے 1930ء میں علی گڑھ سے ایم ایس سی کیمسٹری کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔

زمانہ طالبعلمی کے دوران لاہور اور علی گڑھ میں شیخ عبداللہ کو علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا شوکت علی، پنڈت جواہر لعل نہرو، قائداعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی جیسی نامور شخصیات کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ چنانچہ جب علی گڑھ سے ایم ایس سی کی ڈگری لے کر شیخ عبداللہ واپس سرینگر آئے تو اُنہوں نے ریاست کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر 9 مئی 1930ء کو سرینگر میں ریڈنگ روم (دارالطالعہ) کا قیام عمل میں لایا۔ پنجاب اور علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر آنے والے نیز سرینگر کے مسلمان طلباء اس ریڈنگ روم سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ محمد عبداللہ کو بحیثیت سائنس مدرس سرینگر کے ایک سکول میں ملازمت مل گئی۔ اسی اثناء میں اُنہوں نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن جموں کے کارکنوں سے رابطہ کر کے سرینگر میں بھی اس ایسوسی ایشن کی ایک شاخ قائم کر لی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ان دونوں تنظیموں سے منسلک رہے اور سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ان سرگرمیوں سے روکنے کے لئے حکومت نے اُنہیں مظفر آباد ٹرانسفر کر دیا، لیکن شیخ عبداللہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور کھل کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس عرصے میں سرینگر اور جموں میں توہینِ مذہب کے کچھ واقعات پیش آئے، جن کے خلاف ہونے والے ردِ عمل میں شیخ عبداللہ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شیخ عبداللہ کے اس کردار کو دیکھتے ہوئے میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور ان کے خاندان نے انہیں ریاستی عوام کا متفقہ سیاسی قائد قرار دیا اور مسلمانانِ

ریاست سے اپیل کی کہ وہ شیخ عبداللہ کی قیادت میں آگے بڑھیں۔

13 جولائی 1931ء کو سنٹرل جیل سرینگر کے باہر ریاستی پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں 22 مسلمانوں کی شہادت کے بعد مسلم قائدین میں سب سے پہلے شیخ عبداللہ کو گرفتار کیا گیا۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کی پہلی گرفتاری تھی۔ یکم اگست 1931ء کو انہیں حکومت نے عوامی دباؤ کے نتیجے میں دیگر گرفتار راہنماؤں سمیت رہا کر دیا۔ اس رہائی کے بعد شیخ عبداللہ ''شیرِ کشمیر'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کی دوسری گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب ریاستی وزیر اعظم ہری کشن کول اور ان کے مابین 21 ستمبر کو تلخ کلامی ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ کی اس دوسری گرفتاری نے انہیں سیاسی قائد کی حیثیت سے زبردست شہرت عطا کی۔ کچھ عرصہ بعد جب شیخ محمد عبداللہ رہا ہوئے تو انہوں نے پنجاب کے مسلم زعماء کے مشورے سے اور وادی اور جموں کے متحرک مسلم راہنماؤں کے تعاون سے 1932ء میں مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔ آپ کو مسلم کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آنے کے بعد قیادت اور عوامی نمائندگی کے مسئلے پر شیخ محمد عبداللہ کو سب سے پہلے میر واعظ خاندان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ میر واعظ مولانا یوسف شاہ اور ان کے حامیوں نے مسلم کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر کے ''آزاد پارٹی مسلم کانفرنس'' کے نام سے الگ سیاسی جماعت قائم کر لی، لیکن اس سے شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی حیثیت کو کوئی نقصان نہ ہوا۔ اس زمانے میں شیخ محمد عبداللہ نے آل انڈیا نیشنل کانگریس اور اس کے قائدین سے اپنے روابط استوار کیے۔ چنانچہ 1939ء میں انہوں نے سیاسی جدوجہد میں ریاست کے غیر مسلموں کو بھی شامل کرنے کے لئے مسلم کانفرنس کا نام بدل کر اسے نیشنل کانفرنس کا نام دیا۔ نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آتے ہی شیخ عبداللہ کی ریاستی مسلمانوں میں غیر متنازعہ حیثیت ختم ہو گئی اور مسلمانوں کا ایک مؤثر طبقہ ان کے خلاف ہو گیا۔ اسی طبقے نے 1942ء میں دوبارہ مسلم کانفرنس کا احیاء عمل میں لایا۔ 1944ء میں شیخ عبداللہ کے سیاسی نظریات میں ایک اور تبدیلی آئی اور انہوں نے کمیونسٹ تحریک سے متاثر ہو کر ''نیا کشمیر'' کا منشور جاری کیا۔ 1946ء میں انہوں نے ''کشمیر چھوڑ دو تحریک'' شروع کی۔ اس تحریک میں گرفتاری کے سبب انہیں زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ اگرچہ تحریک ناکام ہو گئی، لیکن اس سے شیخ محمد عبداللہ نے ذاتی مفاد ضرور حاصل کیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں کانگریس کھل کر ریاستی معاملات میں مداخلت کرنے لگی اور نہرو نے شیخ محمد عبداللہ کا نہ صرف مقدمہ لڑا، بلکہ انہیں اپنا بہترین دوست اور ساتھی قرار دیا۔ اس تحریک میں شیخ محمد عبداللہ گرفتار ہو گئے اور ان پر مقدمہ بغاوت قائم ہوا۔ وہ 16 ماہ تک پسِ دیوارِ زنداں رہنے کے بعد 1947ء کو ریاست جموں کشمیر تقسیم کے دہانے پر کھڑی تھی۔ 21 اکتوبر 1947ء کو ریاست جموں کشمیر پر پاکستان نے قبائلیوں سے حملہ کروا دیا جس کے نتیجے میں 26 اکتوبر کو مہاراجہ ہری سنگھ ریاست کے دالحکومت سرینگر کو چھوڑ کر جموں چلا گیا اور اس نے قبائلی حملہ آوروں سے ریاست کو بچانے کے لئے ہندوستان سے فوجی مدد مانگ لی۔ 27 اکتوبر کو ہندوستان کی افواج کشمیر میں داخل ہوئیں۔ اب ریاست کے حالات مہاراجہ کے ہاتھ سے نکل گئے تو اس نے 29 اکتوبر 1947ء کو شیخ

محمد عبداللہ کو ریاست کا منتظمِ اعلیٰ مقرر کیا اور خود اقتدار سے الگ ہو گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کے ایماء پر ریاستی وزیر اعظم مہر چند مہاجن اور مہاراجہ ہری سنگھ کو ہندوستان نے ریاستی معاملات سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا۔ 1948ء کو جب ہندوستان نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں پیش کیا تو اس نے کشمیری نمائندے کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ کو اقوام متحدہ میں بھیجا۔ اقوام متحدہ میں جب مسئلہ کشمیر پیچیدہ ہو گیا تو شیخ محمد عبداللہ نے کشمیریوں کے لئے رائے شماری کا مطالبہ شروع کر دیا، چنانچہ اسی پاداش میں انہیں 8 اگست 1953ء کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سے الگ کر کے بھارت نے پسِ دیوارِ زنداں دھکیل دیا۔ فروری 1958ء میں انہیں رہا کیا گیا، لیکن چند ماہ بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور پھر وہ 1964ء تک گرفتار رہے۔ رہائی کے بعد ان کی ملاقات پنڈت جواہر لعل نہرو سے دہلی میں ہوئی تو پنڈت نہرو نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اگر پاکستان جا کر پاکستان کو کشمیر سے اپنی فوجیں نکالنے پر رضامند کر لیں تو بھارت بھی کشمیر سے اپنی افواج نکال لے گا، چنانچہ شیخ محمد عبداللہ 24 مئی 1964ء کو راولپنڈی پہنچے۔ پاکستانی اور کشمیری حکام سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں، لیکن ابھی تین روز ہی گزرے تھے کہ 27 مئی 1964ء کو پنڈت نہرو انتقال کر گئے، چنانچہ شیخ محمد عبداللہ اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر 20 مئی 1964ء کو واپس دہلی چلے گئے۔

مارچ 1965ء کو شیخ محمد عبداللہ حج کی غرض سے حجازِ مقدس گئے، جہاں سے وہ کچھ دوسرے ممالک میں بھی چلے گئے اور وہاں انہوں نے کشمیر میں بھارتی مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ چنانچہ بھارت نے انہیں فوری واپس آنے کی ہدایت کی، وہ 7 مئی 1965ء کو پالم ایئر پورٹ دہلی پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس بار وہ 2 جنوری 1968ء تک نظر بند رہے۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں جب پاکستان دولخت ہو گیا تو شیخ محمد عبداللہ کو سخت مایوسی ہوئی چنانچہ انہوں نے اپنی سیاسی ساکھ بحال کرنے کے لئے ایک بار پھر ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے انہوں نے کئی ملاقاتیں کیں، چنانچہ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں نومبر 1974ء کو کشمیر حکومت اور بھارت سرکار کے مابین کشمیر ایکارڈ ہوا، جس کے تحت شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر پر بھارتی قبضے کو تسلیم کر لیا اور حقِ خود ارادیت کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ وہ فروری 1975ء کو کشمیر کے وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔

1977ء میں کشمیر اسمبلی کے انتخابات ہوئے، جس میں نیشنل کانفرنس نے بھاری اکثریت حاصل کی۔ چنانچہ ایک بار پھر شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ بن گئے۔ 8 ستمبر 1983ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور جھیل ڈل کے کنارے نسیم باغ میں انہیں دفن کیا گیا۔

میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہؒ

(1890ء - 1968ء)

میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ 22 شعبان 1313 ہجری بمطابق 1890ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر واعظ رسول شاہ تھا، جو میر واعظ خاندان کے سربراہ تھے۔ یہ خاندان اپنے روحانی فیض کی وجہ سے وادیٔ کشمیر میں غیر معمولی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس خاندان نے وادیٔ کشمیر میں مسلمانوں کی دینی، روحانی اور فکری راہنمائی کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے پرآشوب دور میں مسلمانوں کی فلاح و اصلاح کے لئے اس خاندان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ میر واعظ رسول شاہ نے 1897ء میں سرینگر میں ''انجمن نصرت الاسلام'' کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن نے وادیٔ کشمیر میں بہت سے دینی مدارس قائم کیے۔ حکومت بھی اس انجمن کو مالی امداد مہیا کرتی تھی۔

میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محترم اور سرینگر کے علماء سے حاصل کی۔ بعد ازاں یہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ وادیٔ کشمیر میں واپس آگئے اور دینی خدمات سرانجام دینے لگے۔ اس عرصے میں وادی میں مسلمانوں نے سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ریڈنگ روم کے بانی ممبر شیخ محمد عبداللہ نے جب ملازمت کو خیرباد کہہ کر سیاست میں قدم رکھا تو انہیں عوام میں متعارف کروانے اور قوت و اعتماد عطا کرنے میں میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ اور ان کے خانوادے نے بنیادی کردار ادا کیا۔ 21 جون 1931ء کو خانقاہ معلّیٰ میں ہونے والے جس جلسۂ عام میں مہاراجہ کو مطالبات پیش کرنے کیلئے مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد تشکیل دیا گیا تھا، میر واعظ اس وفد میں شامل تھے۔ 13 جولائی 1931ء کے المناک سانحہ کے بعد پیش آمدہ حالات میں میر واعظ مولانا یوسف شاہ نے مسلمانوں کی بھرپور راہنمائی کی۔

1932ء میں جب مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے اس میں بنیادی کردار ادا کیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد جب خاندانی عزت و وقار اور شخصی اثر و رسوخ کے مسئلہ پر آپ کے اور شیخ عبداللہ کے مابین اختلافات بڑھ گئے تو آپ مسلم کانفرنس سے علیحدہ ہو گئے اور 1933ء میں آزاد پارٹی مسلم کانفرنس کے نام سے آپ نے ایک الگ سیاسی جماعت قائم کر لی۔ 1934ء میں جموں کشمیر پرجاسبھا کے پہلے عام انتخابات میں آپ کی جماعت نے وادیٔ کشمیر کے انتخابی حلقوں میں اپنے اُمیدوار کھڑے کیے، لیکن شیخ عبداللہ کی جماعت مسلم کانفرنس نے ان اُمیدواروں کو شکست دے دی۔ میر واعظ یوسف شاہ سیاست سے مایوس ہو گئے۔ اُن کی جماعت بھی عوامی مقبولیت حاصل نہ کر پائی تو وہ

سیاست سے کنارہ کش ہو کر پھر دینی سرگرمیوں کی طرف ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ 1939ء میں جب شیخ عبداللہ کی کوششوں سے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل دیا گیا تو میر واعظ یوسف شاہ ایک بار پھر سیاسی میدان میں متحرک ہوئے اور شیخ عبداللہ کے سیاسی اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے مسلم کانفرنس کے احیاء کی کوششوں میں آپ بھی شامل ہو گئے۔ 1942ء میں جب مسلم کانفرنس کا باقاعدہ احیاء عمل میں آیا تو آپ اس جماعت میں شامل ہو کر ایک بار پھر سیاست میں بھرپور کردار ادا کرنے لگے۔ اس عرصے میں وادیٔ کشمیر ''شیر بکرا'' لڑائیوں کا مرکز بن گئی۔ میر واعظ یوسف شاہ اور شیخ عبداللہ کے کارکن ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے لگے۔ جون 1946ء میں مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ سرینگر کی صدارت آپ نے کی۔ اسی اجلاس میں مسلم کانفرنس نے ''فری کشمیر'' قرارداد پیش کی اور خودمختار کشمیر کو اپنا مطمعٔ نظر قرار دیا۔ 1946ء میں مسلم کانفرنس نے شیخ عبداللہ کی ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کا اثر ختم کرنے کیلئے جب سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور جماعت کی تمام مرکزی قیادت پسِ دیوارِ زنداں چلی گئی تو میر واعظ مولانا یوسف شاہ جماعت کے ایک دھڑے کے صدر بن گئے۔ جبکہ چوہدری حمیداللہ کی قیادت میں ایک دوسرا دھڑا جموں میں قائم ہو گیا۔

1947ء میں آپ مسلم لیگی راہنماؤں سے ملنے کے لئے پاکستان آگئے، لیکن اسی اثناء میں پاکستان کی طرف سے کشمیر پر قبائلی حملے کے سبب واپس نہ جا سکے اور پھر مستقلاً یہیں رہ گئے، کیونکہ شیخ عبداللہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اب ان کا وطن واپس جانا ناممکن تھا۔ حکومتِ آزاد کشمیر کا قیام عمل میں آنے کے بعد میر واعظ مولانا یوسف شاہ کو 1949ء میں آزاد کشمیر کا وزیر تعلیم بنایا گیا، لیکن آپ نے وزارت کو قبول نہ کیا۔ یکم دسمبر 1951ء سے 21 جون 1952ء تک آپ چند ماہ کے لئے آزاد کشمیر کی کرسی صدارت پر فائز رہے۔ یکم جون 1956ء سے 6 ستمبر 1956ء تک چند ماہ کیلئے آپ دوبارہ آزاد کشمیر کے صدر بنے۔ اسی عرصے میں آپ مسلم کانفرنس کے ''میر واعظ'' دھڑے کے صدر بھی رہے۔ 1964ء میں آپ نے مسئلۂ کشمیر کے سلسلے میں مصر، الجزائر اور دیگر ممالک کا سفر اختیار کیا۔

رفتہ رفتہ آپ نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے راولپنڈی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ 16 رمضان المبارک 1388ء بمطابق 1968ء کو راولپنڈی میں آپ کا انتقال ہوا۔ انہوں نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ انہیں مظفرآباد میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق انہیں مظفرآباد میں سپریم کورٹ کے احاطے میں اپراڈا کے قریب دفن کیا گیا۔

میر واعظ مولانا یوسف شاہ کشمیر کے سیاسی و مذہبی حلقوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور تھا۔ انہوں نے قرآن پاک کے بیس پاروں کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا۔ آپ نے سرینگر سے سہ روزہ اخبار ''اسلام'' اور ایک رسالہ ''راہنما'' بھی جاری کیا۔ آپ نے 1947ء سے پہلے وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی و سماجی حقوق کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ تقسیم کشمیر کے بعد انہیں پاکستانی و بھارتی مقبوضہ کشمیر میں یکساں مقام حاصل رہا۔

سردار محمد ابراہیم خان

(1915ء - 2003ء)

سردار محمد ابراہیم خان 22 اپریل 1915ء کو پونچھ کے قصبہ راولاکوٹ کے قریب ہورنہ میرہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سدھن قبیلے سے تھا۔ ان کے والد کا نام محمد عالم خان تھا۔ سردار محمد ابراہیم خان نے 1933ء میں پونچھ شہر کے ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1938ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ 1940ء میں ریاستی حکومت نے اُن کا تعلیمی وظیفہ مقرر کیا اور وہ بار ایٹ لاء کے لئے انگلستان چلے گئے۔ 1942ء میں وہ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس آئے تو حکومت نے اُنہیں میرپور میں پبلک پراسیکیوٹر (پی پی) تعینات کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد آپ کو ترقیاب کر کے بطور اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل جموں میں تعینات کر دیا گیا۔ دوران ملازمت اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ سرکاری ملازمت کی پابندیاں برداشت نہیں کر سکیں گے، لہٰذا اُنہوں نے ملازمت کو خیرباد کہہ کر سیاسی میدان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ اکتوبر 1946ء کو وہ اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی۔ پونچھ کے حلقہ انتخاب سے ریاستی اسمبلی پرجا سبھا کے ممبر خان محمد خان نے اُنہیں پیشکش کی کہ وہ جنوری 1947ء میں ہونے والے انتخابات میں ان کی جگہ اس حلقے سے مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لیں۔ چنانچہ سردار ابراہیم خان جنوری 1947ء میں کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے کر کامیاب ہو گئے۔ ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ ممبر اسمبلی کی حیثیت سے اُنہوں نے اسمبلی میں باوقار کردار ادا کیا۔ اسمبلی میں وہ مسلم کانفرنس کے چیف وہپ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔

1946ء میں مسلم کانفرنس کے کچھ سینئر راہنما سول نافرمانی کی۔ تحریک کی پاداش میں پس دیوار زنداں تھے، چونکہ سردار محمد ابراہیم خان گرفتار نہیں ہوئے تھے اس لئے اُنہوں نے اس نازک دور میں جماعتی سطح پر اہم ذمہ داریاں سرانجام دیں۔ میرواعظ مولانا یوسف شاہ اور چوہدری حمیداللہ خان کی باہمی رقابت کے سبب چونکہ مسلم کانفرنس دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ جماعت کو اس انتشار سے بچانے کے لئے سردار محمد ابراہیم خان نے بنیادی کردار ادا کیا۔ 19 جولائی 1947ء کو ان کے گھر محلّہ آبی گزر سرینگر میں مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس ہوا، جس میں مہاراجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ریاست جموں کشمیر کا الحاق پاکستان سے کرے۔

تقسیم ہند کے فوری بعد جب ریاست جموں کشمیر میں حالات بگڑنے لگے تو سردار محمد ابراہیم خان اپنے ایک دوست راجہ عبدالحمید خان آف مظفرآباد کی رفاقت میں 25 اگست 1947ء کو سرینگر سے نکل کر مظفرآباد کے راستے

ایبٹ آباد پہنچ گئے۔

اسی اثناء میں کشمیر پر قبائلی حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں مری ایبٹ آباد اور کچھ دیگر مقامات پر صلاح مشورے جاری تھے۔ سردار محمد ابراہیم خان بھی ان اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ 4 اکتوبر 1947ء کو خواجہ غلام نبی گلکار کی سربراہی میں پیرس ہوٹل راولپنڈی کے مقام پر ایک انقلابی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا ہیڈکوارٹر مظفرآباد کو بنایا گیا۔ سردار محمد ابراہیم خان اس حکومت میں پرائم منسٹر مقرر ہوئے۔ 21 اکتوبر کو پاکستان نے مسلح قبائلیوں کے ذریعے ریاست پر حملہ کروا دیا۔ جس کے نتیجے میں کشمیر کا چھوٹا سا ٹکڑا ڈوگرہ فوجوں سے خالی ہو گیا۔ 24 اکتوبر کو حکومتِ پاکستان کے ایماء پر سردار محمد ابراہیم خان کی سربراہی میں آزاد انقلابی حکومت کی تشکیل نو عمل میں لائی گئی اور جنجال ہل پلندری کو اس کا ہیڈکوارٹر بنایا گیا۔

ان نازک ترین لمحات میں سردار محمد ابراہیم خان نے آزاد حکومت کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں۔ فروری 1948ء میں سردار محمد ابراہیم خان کو قائداعظم کے ایماء پر اقوام متحدہ میں بھیجا گیا تاکہ وہ سلامتی کونسل کے سامنے کشمیریوں کے نمائندے کی حیثیت سے اپنا کیس خود پیش کریں، لیکن اس وقت کے وزیر خارجہ ظفراللہ خان نے اُنہیں سلامتی کونسل کے سامنے پیش ہونے اور اپنا مؤقف پیش کرنے سے منع کر دیا۔ چنانچہ سردار صاحب نے پریس کانفرنسوں کے ذریعے دنیا کو اپنے مؤقف سے آگاہ کیا۔

1948ء میں جب چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے دیگر راہنما مقبوضہ کشمیر سے رہا کر کے پاکستان بھیج دیئے گئے تو سردار محمد ابراہیم خان نے ان راہنماؤں کو بحیثیت صدر آزاد کشمیر خوش آمدید کہا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلم کانفرنس کے ان راہنماؤں سے سردار محمد ابراہیم خان کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اختلافات کا بنیادی سبب جماعتی قیادت اور کرسی صدارت تھی۔ مسلم کانفرنس دن بدن خلفشار کا شکار ہوتی گئی اور بالآخر تین دھڑوں میں تقسیم ہو گئی، جن میں عباس گروپ، ابراہیم گروپ اور میرواعظ گروپ شامل تھے۔

مئی 1950ء کو وزارتِ امور کشمیر نے سردار محمد ابراہیم خان کو کرسی صدارت سے الگ کر دیا۔ ان کی جگہ کرنل علی احمد شاہ کو صدر بنایا گیا۔ 1957ء کو سردار محمد ابراہیم خان دوسری بار آزاد کشمیر کے صدر نامزد ہوئے اور 1959ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ 1959ء میں حکومتِ پاکستان نے اُنہیں گرفتار کر کے سنٹرل جیل راولپنڈی میں قید کر دیا، جہاں سے 28 روز بعد اُنہیں رہا کیا گیا۔ آزاد کشمیر کے پہلے صدارتی انتخابات منعقدہ 1961ء میں اُنہوں نے حصہ لیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اُنہوں نے 1970ء کے صدارتی انتخابات میں بھی حصہ لیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ 5 جون 1975ء سے 30 اکتوبر 1978ء تک وہ تیسری بار آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ چوتھی بار 23 اگست 1996ء سے 24 اگست 2001ء تک وہ آخری بار اس منصب پر فائز رہے۔ چوتھی بار اس منصب سے فارغ ہونے کے بعد پیرانہ سالی کے باعث وہ اپنے گاؤں کوٹ متے خان میں قیام پذیر رہے۔ 31 جون 2003ء کو وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ ان کو آبائی گاؤں میں سپرد خاک کیا گیا۔ اُنہوں نے اپنی آخری آرام گاہ اپنی زندگی میں ہی تیار کروا رکھی تھی۔

سردار محمد ابراہیم خان نے آزاد کشمیر کی سیاست میں بہت متحرک کردار ادا کیا۔ پاکستان کی آمرانہ حکومتوں اور ان کی کشمیر دشمن پالیسیوں سے وہ ہمیشہ نالاں رہے۔ ایسی حکومتوں سے ان کے تعلقات اکثر کشیدہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے تک اُنہوں نے آزاد کشمیر کی سیاست سے بھی کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ سردار محمد ابراہیم خان نے میدانِ سیاست کے علاوہ قلمی محاذ پر بھی خدمات سرانجام دیں۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری ''متاعِ زندگی'' 60 کی دہائی میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے ''کشمیر کی جنگ آزادی'' کے عنوان سے اُردو میں ایک اور کتاب لکھی اور پھر انگریزی میں مسئلہِ کشمیر کے حوالے سے ایک کتاب "Kashmir Saga" لکھی۔ اس کتاب میں اُنہوں نے ایک آزاد ریاست جموں کشمیر کو قضیۂ کشمیر کا پسندیدہ حل قرار دیا۔

کتابیات

-1 جسٹس محمد یوسف صراف "Kashmiri's Fight for Freedom" جلد اوّل، دوم
ناشر: فیروز سنز لاہور اشاعت اوّل 1977ء

-2 پنڈت پریم ناتھ بزاز "The History of Struggle for Freedom in Kashmir"
ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان اشاعت 1976ء

-3 وریندر گروور "Story of Kashmir - Yesterday & Today" جلد I، II، III
ناشر: ڈیپ اینڈ ڈیپ پبلی کیشنز نیو دہلی اشاعت 1995ء

-4 "Kashmir on Trial" ناشر: لائن پریس لاہور اشاعت 1947ء

-5 منظور الحسن گیلانی "Constitutional Development in AJK" اشاعت 1988ء

-6 مولوی حشمت اللہ خان ''تاریخ جموں'' ناشر: ویری ناگ پبلشرز میر پور اشاعت 1991ء

-7 خواجہ غلام احمد پنڈت ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' ناشر: جنگ پبلشرز لاہور اشاعت 1991ء

-8 ڈاکٹر سلام الدین نیاز ''ان کہی داستانِ کشمیر'' ناشر: کلاسیک لاہور اشاعت 1992ء

-9 محمد شریف طارق ایڈووکیٹ ''جموں کشمیر کی جنگِ آزادی کی کہانی تاریخ کی زبانی''
ناشر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس راولپنڈی اشاعت اوّل 2003ء

-10 چوہدری غلام عباس ''کشمکش'' ناشر: کشمیر لبریشن سیل اشاعت دوم

-11 پروفیسر محمد سرور عباسی ''کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی''
ناشر: ادارہ مطالعہ کشمیر آزاد کشمیر یونیورسٹی اشاعت اوّل 1992ء

-12 پریم ناتھ بزاز ''تاریخ جدوجہد آزادیٔ کشمیر'' اُردو ترجمہ عبدالحمید نظامی
ناشر: ویری ناگ پبلشرز میر پور اشاعت اوّل 1992ء

-13 میر عبدالعزیز ''کشمیر کی تاریخِ آزادی'' ناشر: پاکستان پبلشرز لاہور

-14 وی۔ پی مینن ''کشمیر اور جونا گڑھ کی کہانی'' اُردو ترجمہ رئیس احمد جعفری

ہماری تاریخ کا ایک گمشدہ باب

مظفرآباد کے مقتل سے

ایک ماں کی سچی کہانی

از قلم: کرشنا مہتا

22 اکتوبر 1947ء کو مظفرآباد پر ہونے والے قیامت خیز قبائلی حملے کی عینی شاہد کرشنا مہتا کی لکھی ہوئی کتاب، جس میں اس نے کئی چھپی ہوئی حقیقتوں اور اہلیان مظفرآباد، کشمیر پر بیتی ہوئی قیامت کی لرزہ خیز داستان بیان کی ہے۔ مصنفہ اکتوبر 1947ء میں مظفرآباد میں تعینات وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) دونی چند مہتا کی بیوی تھی۔ خاوند کے قتل کے بعد وہ تین ماہ تک مظفرآباد کے مقتل میں موت کی منتظر رہی۔ بالآخر موت اس سے روٹھ گئی اور وہ اپنے معصوم بچوں کے ہمراہ قیدیوں کے تبادلے میں ہندوستان چلی گئی۔ وہاں جا کر اس نے اپنی زخم زخم یادوں پر مشتمل یہ کتاب قلم بندی۔ یہ تاریخی داستان اب اردو زبان میں منظر عام پر آ گئی ہے۔ اس دلچسپ اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کتاب میں آپ پڑھیں گے۔

- ☆ 22 اکتوبر 1947ء کو مظفرآباد پر قبائلی حملہ کب کیوں اور کیسے ہوا؟
- ☆ مظفرآباد کے وزیر وزارت دونی چند مہتا نے مظفرآباد کو چھوڑنا کیوں گوارہ نہ کیا اور اپنے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے کیسے دلیرانہ انداز میں جان قربان کر دی۔
- ☆ ماسٹر عبدالعزیز قریشی کو غیر مسلم عورتوں اور بچوں کو پناہ دینے کے جرم میں قبائلیوں نے کیسے بے دردی سے شہید کیا؟
- ☆ خاوند کے قتل کے بعد کرشنا مہتا کہاں کہاں اور کن کن حالات میں موت سے لڑتی رہی؟
- ☆ خونخوار اور درندہ صفت قبائلیوں میں فرشتہ صفت انسان کہاں سے آ گئے تھے؟
- ☆ دومیل کے وزیری ہسپتال میں محصور نوجوان عورتوں، بچیوں نے اجتماعی خودکشی کیوں کی؟
- ☆ ایک چوکیدار، مولوی، فوجی افسر، ڈاکٹر، فارسٹر، منہ بولے بھائی، قبائلی لیڈر، کیمپ کمانڈر اور صدر آزاد کشمیر کا کیا کردار رہا؟
- ☆ مظفرآباد کے پُرامن معاشرے کو تباہ کرنے والے مستقبل کی کیا منصوبہ بندی کر گئے ہیں؟
- ☆ زندگی تو سب کو پیاری ہوتی ہے لیکن جب کبھی زندگی سے نفرت ہو جائے تو موت کیوں روٹھ جاتی ہے؟؟؟؟؟
- ☆ تاریخ، سیاست، سماج، زندگی اور عظیم انسانی آدرشوں سے متعلق تجربات و مشاہدات کا سبق آموز خلاصہ۔ ضرور پڑھیے۔

اپنے قریبی بک سٹال سے حاصل کریں۔ خوبصورت اور دیدہ زیب ایڈیشن، صفحات 160 قیمت 200 روپے

شائع کردہ: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نکس) میرپور

0344-5663443 E.Mail: niks.mirpur@gmail.com

محمد سعید اسعد کی تخلیقات

یادوں کے زخم

از قلم: محمد سعید اسعد

1947ء میں ریاست جموں کشمیر پر ایک طے شدہ منصوبے کے تحت پاکستان نے مسلح قبائلی لشکریوں سے جو تباہ کن حملہ کروایا اُس کے چشم دید گواہوں کی انمٹ یادیں، جنھیں نگری نگری گھوم کر جمع کیا گیا ہے۔ یہ سچی کہانیاں پہلی بار یکجا کر کے کتابی صورت میں منظر عام پر لائی گئی ہیں۔ اس کتاب کو قارئین کی طرف زبردست پذیرائی ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انگریزی ایڈیشن بھی "Wounded Memories" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ہماری تاریخ کے بہت سے چھپے گوشے اس کتاب میں آشکارا ہوتے ہیں۔

قیمت 200 روپے